Date of Publication: 23-08-2013

PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 24-25 August 2013
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

1-7 September 2013
Issue: 33, Vol.: 72

یکم تا ۷ر ستمبر ۲۰۱۳ء
شمارہ نمبر: ۳۳، جلد نمبر: ۷۲

یہ برصغیر کے ایک ایسے فن کار کی کہانی ہے جس کا رنگ کالا تھا مگر وہ من کا اُجلا تھا۔ یقین محکم اور عمل پیہم سے وہ پستیوں سے فلک کی بلندی پر جا پہنچا۔ اُس نے پران کو چوٹی کا اداکار بنایا۔ آشا پوسلے اور صبیحہ کی شہرت و مقبولیت اسی کی مرہونِ منت ہے۔ ۱۹۳۶ء میں اس کی پنجابی فلم 'سسی' میں اداکارہ بالو نے ہیروئن کا کردار نبھایا تھا۔ 20 برس بعد اسی بالو کی بیٹی صبیحہ نے اسی نام کی اردو فلم میں اس ہدایت کار کے تحت یہی رول ادا کیا۔ اس کی کئی فلموں نے جوبلی منائی ——— طاؤس

ملکہ چاند بی بی کے خانوادے کا فلم ڈائرکٹر داؤد چاند

اردو نہیں جانتا تھا پھر بھی اردو فلمیں بناتا تھا

وشوا ناتھ طاؤس (C-38، سیکٹر 39، نوئیڈا [یوپی] 201303)

متحدہ ہندستان میں داؤد چاند فلم انڈسٹری میں ایک جانا پہچانا نام تھا۔ اس کا پورا نام داؤد ہاشم تھا اور چاند کا لفظ اس کے نام کے ساتھ اس لیے لگا ہوا تھا کہ اس کا سلسلۂ نسب دکن کی مشہور اور دلیر حکمران چاند بی بی سے جا ملتا تھا۔ اس کا رنگ حبشیوں کی طرح سیاہ تھا، ہر وقت ایک میلی سی قمیص اور تہمد باندھ کر اسٹوڈیو میں ادھر اُدھر پھرتا اور کام کرتا رہتا تھا۔ کسی بھی لحاظ سے وہ چاند کہلانے کا مستحق نہیں تھا پھر بھی سب لوگ چاند کہہ کر پکارتے تھے۔ اُس میں تعلیم کی کمی تھی، وہ اردو یا پنجابی زبان سے اچھی طرح آشنا نہیں تھا لیکن ان دونوں زبانوں میں فلمیں بناتا تھا۔ وہ گجرات میں پیدا ہوا تھا اور گجراتی اُس کی مادری زبان تھی۔ کاغذ اور پنسل لے کر اسی زبان میں اپنا کام کرتا رہتا تھا اور حساب کتاب کرتا تھا۔ وہ گجراتی میں کہانی کا ڈھانچہ تیار کرتا اور پھر فلم بنانے کے بارے میں سوچنے لگتا۔ لگاتار پان کھاتا رہتا اور اسی عالم میں اپنے کارندوں کو حکم دیتا کہ یہ کام کرو اور یہ مت کرو۔

ان تمام کمزوریوں کے باوجود وہ کمال کا فلم ڈائرکٹر تھا۔ کامیاب اس لیے تھا کہ وہ ایک ہوشیار فلم اڈیٹر بھی تھا۔ اچھے اڈیٹر کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ اس کی فلم میں تسلسل برقرار رہے۔ ایڈیٹنگ کا کام بے حد مشکل ہوتا ہے۔ رش پرنٹ جب اس کے سامنے پڑے ہوتے ہیں اور قینچی اُس کے ہاتھ میں ہوتی ہے تو چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ رات رات بھر جاگ کر پرنٹس کی کاٹ چھانٹ کر کے انہیں تسلسل کے ساتھ جوڑا جاتا ہے تب کہیں جا کر فلم کا فائنل پرنٹ تیار ہوتا ہے۔ ایڈیٹنگ میں جان نہ ہو تو فلم فلاپ ہو جاتی ہے۔ دوسری خوبی چاند میں یہ تھی کہ وہ فلم کو کبھی لٹکاتا نہیں تھا۔ فلم کی شوٹنگ کو لمبا کھینچ کر فنانسر کا روپیہ برباد کرنا اسے پسند نہیں تھا۔ وہ جلد سے جلد فلم کو مکمل کر لینے پر یقین کرتا تھا۔ کام کی اسی تیز رفتاری کے باعث اُس کے پاس ہمیشہ فلم کی ڈائرکشن کی آفرز موجود رہتی تھیں۔ بعض اوقات اُس نے بیک وقت چار چار فلموں کی ہدایت کاری کی اور فلم انڈسٹری میں یہ ایک ریکارڈ تھا۔

مجھے یہ تو یاد نہیں کہ اُس کی پہلی فلم کون سی تھی لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ اُس نے ۱۹۳۶ء میں کلکتہ میں 'سسی پنوں' پنجابی زبان میں بنائی تھی۔ اس فلم کی ہیروئن بالو (اقبال بیگم) تھی۔ یہ پنجاب کے شہر گجرات کی وہی بالو تھی جس کا محمد علی ماہیا کے ساتھ رومانس بڑا مشہور ہوا تھا اور بالو ماہیا کے ٹپے پورے پنجاب میں گائے جاتے تھے۔ یہ فلم باکس آفس پر ہٹ ثابت ہوئی تھی۔ اپنے دور کی مشہور کلاسیکل سنگر کملا جھریا نے خود فلم کے پردے پر پنجابی غزل 'روز ازل دے پیار پرانے' گائی تھی۔ برسوں تک پنجاب کے میلوں ٹھیلوں میں یہ فلم ٹورنگ سنیماؤں میں دکھائی جاتی رہی۔ اس نے بالو کو ہی ہیروئن بنا کر ایک اور پنجابی فلم 'سوہنی مہیوال' بنائی جس میں نور جہاں نے سوہنی کے بچپن کا رول ادا کیا تھا۔ یہ فلم بھی کامیاب ثابت ہوئی۔ اس فلم کی شوٹنگ کے دوران بالو کو تپ دق ہو گیا۔ ان دنوں اس مرض کا کوئی مکمل علاج نہیں تھا اور مریض کی موت یقینی سمجھی جاتی تھی۔ بالو سوکھ کر کانٹا ہو گئی اور اب اُسے کیمرے کے سامنے لانا بے کار تھا کیوں کہ چہرے کی ساری کشش ختم ہو گئی تھی۔ داؤد چاند بڑا پریشان تھا کہ فلم ختم ہونے کو آئی تو ہیروئن قریب المرگ ہو گئی۔ اُس نے فلم مکمل کرنے کے لیے اپنی بیوی شاہجہاں بیگم کو تیار کیا۔ اُس کا میک اپ اس ڈھنگ سے کیا کہ وہ بالو ہی نظر آئے اور پھر کیمرہ ٹرک سے اُس کی بیک اور سائیڈ پوز لے کر اس ڈھنگ سے باقی کے مناظر فلمائے کہ تماشائیوں کو بالکل پتا نہ چلا کہ وہ بالو کی جگہ ایک دوسری عورت کو دیکھ رہے ہیں۔

داؤد چاند کو ملک گیر شہرت اُس وقت ملی جب اُس نے حصولِ آزادی سے ڈیڑھ دو برس قبل پران اور آشا پوسلے کو لے کر فلم 'پرائے بس میں' بنائی۔ رام لال، ویک آشا اور نذر نے بھی اس میں اہم کردار انجام دیے تھے۔ گیت لکھنے والوں میں اردو کے مشہور شاعر طفیل ہوشیار پوری کا نام بھی شامل تھا۔ یہ فلم ایک طوائف کی زندگی کے گرد گھومتی تھی۔ طوائف کو موضوع بنا کر اب تک بے شمار فلمیں بن چکی ہیں جن میں مہندی، زندگی اور طوفان، عدالت، ممتا، پاکیزہ، امراؤ جان، سڑک، چاندنی بار، شرافت بہت کامیاب ثابت ہوئیں لیکن میری رائے میں 'پرائے بس میں' ان سب سے بہتر تھی اور آج تک کوئی بھی فلم اس کا مقابلہ نہیں کر سکی۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ اس کی ہیروئن آشا پوسلے خود طوائف تھی۔ وہ لاہور کی بدنام ہیرا منڈی (شاہی محلّہ) کی پیداوار تھی اس لیے اس کی اداکاری عین فطری تھی۔ وہ بلا کی خوب صورت تھی، اس کی ادائیں، چال ڈھال، رقص سب دیکھنے کے قابل تھے۔ اس کے بارے میں سعادت حسن منٹو نے ایک بار کہا تھا "آشا پوسلے کو سمجھا کرے کوئی"۔ نوجوان اس کے حسن جہاں سوز کے قائل تھے۔ میکلوڈ روڈ لاہور کے رائل پارک (Royal Park) میں جہاں تقسیم وطن سے پہلے فلم کمپنیوں اور ڈسٹری بیوٹروں کے دفاتر ہوا کرتے تھے، آشا پوسلے اور راگنی کا ہر روز کا آنا جانا تھا۔ فرق اتنا تھا کہ راگنی وہاں برقعہ پہن کر جایا کرتی تھی (حالاں کہ وہ بھی طوائفوں کی اسی ہیرا منڈی سے آئی تھی) اور آشا پوسلے اپنی زلفوں کو پوری سج دھج سے بکھیرتی ہوئی ننگے سر وہاں پہنچا کرتی تھی۔ لاہور کے کالجوں میں پڑھنے والے دل پھینک نوجوان گھنٹوں رائل پارک میں آشا

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ: ایک تعارف

محمد ایوب واقف
سی کوین ایونیو-بی، فلیٹ نمبر ۵۰۷، ساتویں منزل، سیکٹر ۱۴، کوپر کھیرانے، نئی ممبئی-۴۰۰۷۰۹

تعلیم و تعلّم، ہنرمندی اور کارجوئی کے چلن اور علوم وفنون پر مشتمل کتب خانوں کی کثرت سے ہی معاشرہ مہذب و متمول ہوتا ہے۔ ان سے قدیم روابط اور تعلقات استوار رکھنے سے انسانوں کے دلوں کی خشک کھیتیاں ترو تازہ اور ہری بھری رہتی ہیں۔ اذہان پراگندگی، تعطل اور انتشار کا شکار نہیں ہوتے۔ لیکن بدقسمتی سے جب کوئی عاقبت نااندیش، خارج از عقل، مطلق العنان اور دشمنِ انسانیت تاتاری حکمراں ہلاکو کی شکل میں وجود میں آجاتا ہے تو پھر ساری تہذیبی و ثقافتی قدریں تاخت و تاراج ہوجاتی ہیں، طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوجاتا ہے، علوم وفنون کے خزائن و دفائن تاراجیت، لاقانونیت اور جبر و تعدی کی آگ میں جل کر خاکستر کا روپ اختیار کرلیتے ہیں۔ آپ ذرا ساتویں صدی ہجری کی پُرآشوبی اور ہولناکی کو اپنے ذہن وخیال میں لائیں تو پتا چلے گا کہ ایران، عراق، مصر، شام اور روم جو صدیوں کی جدوجہد اور مسلسل تگ و دو کے بعد علوم وفنون کے درخشاں مراکز بن کر دنیائے اسلام کے نقشے پر ابھرے تھے اور جو اپنی علمی فضیلتوں اور فکری و فنی توجہوں سے ایک زمانے کو ضیا بار کررہے تھے، جنھیں مسلم دنیا کے دل و دماغ کہے جانے پر فخر محسوس ہوتا تھا محض چند مہینوں کے اندر تاتاریوں کے فتنوں کے باعث تباہ و برباد ہوگئے۔ بلادِ اسلامیہ کے جو کتب خانے نادر و نایاب کتب و رسائل کی آماجگاہ تھے آناً فاناً میں مٹ گئے اور تہذیب و تمدن کی یادگار بے شمار عمارتیں تہس نہس ہوگئیں، یہ تاریخ کا ایک ایسا المیہ ہے جس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

اس خونی واقعے کے کئی صدیوں کے بعد ۱۸۵۷ء میں ہندستان پر انگریزوں کا حملہ ہوا تو تاتاریوں کی خوں ریزی و مظالم اور سفاکی کی یاد ایک بار پھر تازہ ہوگئی۔ اس میں صرف لاکھوں بے گناہ ہندستانیوں کی قیمتی اور گراں قدر جانیں ہی نہیں گئیں بلکہ مسلمانوں کے کئی سو سال کے دورِ حکومت میں علوم وفنون کی جو بے پایاں تشویق و ترقی ہوئی تھی اور ملک کے طول و عرض میں مسلم بادشاہوں خصوصاً تیموری حکمرانوں نے جو کتب خانے قائم کیے تھے اور ان کتب خانوں میں جو قیمتی کتابیں، قلمی نسخے اور دستاویزات جمع کروائے تھے انھیں انگریزوں نے لوٹ کر ویران کردیا۔ ان لوٹی ہوئی کتابوں، قلمی نسخوں اور نسخ و نستعلیق تحریروں سے منقش اوراق، اسلامی خطاطی کے بے حد قیمتی اور نفیس نمونے جن کی تعداد بلاشبہ لاکھوں میں رہی ہوگی انھیں انگریز حاکموں نے اپنی دسترس میں لے لیا لیکن ان قدیم ترین کتابوں اور قلمی نسخوں کو انگریزوں نے برباد نہیں کیا بلکہ بڑی ہی حفاظت سے انھیں اپنے ملک کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی اور انڈیا آفس لندن میں پہنچادیا۔ آج اہلِ برطانیہ اپنے اس گراں قدر اثاثے پر بڑا ناز کرتے ہیں۔

لیکن خیر سے سارے مخطوطات، مغلوں کے عہد کے قیمتی دستاویزات اور بادشاہوں کے استعمال میں رہنے والی بیش قیمت کتابیں انگریز اپنے ملک میں نہیں لے جاسکے تھے۔ بہت سی کتابیں دست بردِ زمانہ سے محفوظ رہیں۔ ۱۹۴۷ میں جب ملک آزاد ہوا تو ہندستان کی تمام لائبریریوں کی باقی ماندہ کتابوں اور قلمی نسخوں کی از سرِ نو شیرازہ بندی ہوئی، کچھ دوسرے کتب خانے بھی کھولے گئے پھر لائبریریوں کو تجدید کاری کے عمل سے گزارا گیا، اس تجدید کاری نے بعض کتب خانوں کو اہمیت کا حامل بنادیا۔ ایسی لائبریریوں میں سالار جنگ میوزیم کی لائبریری، ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کی لائبریری، دارالمصنفین اعظم گڑھ کی لائبریری، رام پور کی رضا لائبریری، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کی لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری، غالب اکیڈمی دہلی کی لائبریری، جامع مسجد بمبئی کی لائبریری، درگاہ عالیہ چشتیہ شاہ باغ احمد آباد کی لائبریری، جموں و کشمیر اسلامک ریسرچ سنٹر نوشیرہ سری نگر کی لائبریری، اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میسور کی لائبریری، بھوپال کی مولانا آزاد سنٹرل لائبریری، دارالعلوم دیوبند کی لائبریری، ندوۃ العلما لکھنؤ کی لائبریری اور انجمن اسلام ممبئی کی کریمی لائبریری وغیرہ کو خاص مقام حاصل ہے۔

اس مقالے میں ہم جس لائبریری پر خاص طور سے روشنی ڈالنا چاہتے ہیں اس کا نام ہے خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری۔ یہ لائبریری پٹنہ میں واقع ہے۔ آپ میں سے بیشتر لوگوں کو یہ جاننے کی خواہش ہوگی کہ جس شخص کے نام نامی اور اسم گرامی سے پٹنہ کی اس لائبریری کو موسوم کیا گیا ہے آخر وہ کون تھا، آپ کی یہ خواہش بہرحال جائز ہے لہٰذا ہمارا یہ فرض بنتا ہے کہ ہم آپ کو یہ بتائیں کہ خدابخش مرحوم کو علمی و تہذیبی اور سماجی و معاشرتی دنیا میں کیا مقام حاصل تھا، تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ مولوی خدابخش مرحوم نہ صرف پٹنہ کے ایک علمی و تہذیبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے بلکہ وہ برٹش سرکار کی نظروں میں بھی ایک بلند قامت اور بلند مرتبہ شخصیت کے مالک تھے۔ شاید اسی لیے انگریز حکومت نے انھیں خان بہادر کا خطاب مرحمت فرمایا تھا۔ ان کی زندگی میں علم اور رواداری کے خصائص کوٹ کوٹ کر بھرے تھے، انھوں نے اپنی زندگی میں تین شادیاں کیں، ان کی تیسری اور آخری بیوی کا نام رضیہ خاتون تھا، وہ خان بہادر شمس العلما احمد کبیر الدین کی بیٹی تھیں۔ مولوی خدابخش مرحوم نے بی۔اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد وکالت کا امتحان بھی دیا تھا اور اس میں بھی کامیاب ہوئے تھے۔ اُس وقت ان کی وکالت کے کافی چرچے تھے۔ شاید اسی بنیاد پر نظام حیدرآباد نے ۱۸۹۵ء میں انھیں اپنی ریاست کا چیف جسٹس مقرر کیا تھا۔ چناں چہ اس اعلا و ارفع عہدے پر تقرری کے بعد اپنی اہلیہ رضیہ خاتون کے ساتھ وہ حیدرآباد چلے گئے۔ ۱۸۹۸ تک مولوی خدابخش مرحوم نے حیدرآباد میں چیف جسٹس کے عہدے پر کام کیا اور اس کے بعد انھوں نے پٹنہ واپس آکر پھر سے وکالت کا پیشہ شروع کردیا۔

۱۵ راکتوبر ۱۸۹۱ کو انھوں نے اس تاریخی کام کو انجام دیا جس کی بنیاد پر ان کا نام آج تک روشن ہے یعنی انھوں نے تاریخی شہر پٹنہ میں خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری کی بنیاد رکھی، اس طرح وہ اس لائبریری کے بانی ہوئے۔ لائبریری کے قیام کے موقعے پر جو شاندار جلسہ ہوا تھا اس کی روداد پیش کرتے ہوئے 'الپنچ' اخبار نے اپنے صفحات پر لکھا تھا کہ:

''کل ۱۵ راکتوبر ۱۸۹۱ء کو صبح آٹھ بجے ایک جلسہ بغرض افتتاح کتب خانہ خان بہادر مولوی خدا بخش صاحب بمکان کتب خانہ مذکورہ واقع محلہ چوہٹہ باگی پور منعقد ہوا۔ معززین حضار جلسہ کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو ہوگی۔ باتفاق رائے جناب سید بادشاہ نواب صاحب خلف اکبر نواب سید لطف علی خاں مرحوم رونق افروز کرسی صدارت ہوئے، پہلے جناب خان بہادر مولوی خدا بخش خاں صاحب نے ایک دل چسپ اور موثر تقریر فرمائی بعدہ سید محمد خاں صاحب بہادر ڈپٹی مجسٹریٹ نے خدا بخش خاں صاحب کی تقریر کی تائید کی اور فرمایا کہ اس کتب خانہ کے آئندہ مصارف کے لیے کوئی سامان ضرور ہونا چاہیے۔ ہماری قوم اس کا سامان نہ کرے تو اس کے لیے نہایت شرم کی بات ہے۔ اس کے بعد خان بہادر مولوی سید فضل امام صاحب وائس چیئرمین نے فرمایا کہ میں اپنی کل کتابیں کہ جو کچھ میرے پاس موجود ہے اس کتب خانہ میں دے دوں گا۔ بابو گرپرشاد سین صاحب اور بابو گنگادھر پرشاد صاحب وکیل نے بھی نہایت خوشی اور حسن کے ساتھ فرمایا کہ کتب خانہ کی بقا کے لیے سب قوموں کو کوشش کرنا چاہیے۔ اس جلسہ میں اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ علوم وفنون کی کتابیں چاہے وہ کسی زبان میں ہوں کسی خاص قوم یا کسی خاص شخص کی نہیں ہیں جب کہ یہ ایک ودیعت ہے موجودہ دور اور آئندہ نسلوں کے لیے۔ اس کے بعد حاضرین جلسہ نے فہرست چندہ پر دستخط کیے''۔

'الپنچ' اخبار کی ۱۹ راکتوبر ۱۸۹۱ کی اس تفصیلی رپورٹ پر غائر نگاہ ڈالنے سے کچھ خاص باتیں سامنے آتی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ لائبریری کے تاسیسی جلسے کا اہتمام مولوی خدا بخش مرحوم کی قیادت میں انتہائی تزک و احتشام سے کیا گیا۔ دوسری بات یہ کہ خدا بخش کی فرمائش پر حاضرین جلسہ نے نہ صرف اپنے گھروں میں موجود کتابوں کو بطور ہدیہ اور تحفہ لائبریری کو فوراً پیش کیا بلکہ دیگر مصارف کے لیے اور ضرورت کی کتابیں خریدنے کے لیے بڑی بڑی رقمیں بصد شوق پیش کیں۔ تیسری بات اس اخباری رپورٹ سے ہمیں یہ معلوم ہوتی ہے کہ مولوی خدا بخش نے اس جلسے میں بڑی دل چسپ اور موثر تقریر کی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ صرف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں رائج تعلیم میں ہی مہارت نہیں رکھتے تھے بلکہ علمی و ادبی معاملات و مسائل میں بھی پوری دل چسپی رکھتے تھے اور جس لائبریری کی داغ بیل انھوں نے ڈالی تھی اس کے ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل میں ہمہ وقت مصروف بھی رہا کرتے تھے۔ مولوی خدا بخش مرحوم نئی اور پرانی کتابوں بالخصوص قلمی نسخوں کی تلاش میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ اگر انھیں کہیں دور و نزدیک کسی قیمتی مخطوطے کا سراغ لگتا تو فوراً اس کی خریداری کا بندوبست کرتے۔

مولانا شبلی نے جو خود نادر و نایاب کتابوں اور قلمی نسخوں کا اعلا ذوق رکھتے تھے، ایک جگہ لکھا ہے:

''ایک مدت سے ہم اس کتب خانہ کا شہرہ سنتے تھے۔ دلی اور لکھنؤ میں بعض تاجر ہیں جو قلمی نایاب کتابیں جابجا سے بہم پہنچاتے ہیں ان کو نہایت گراں قیمت پر بیچتے ہیں جب ہم بھی ان سے ملے اور کمیاب نسخوں کی فرمائش کی تو انھوں نے

کہا کہ اس قسم کی کتابیں سب سے پہلے مولوی خدا بخش کے پاس جاتی ہیں۔ کیوں کہ ہمارے ملک میں کوئی شخص ان سے زیادہ قیمت نہیں دے سکتا''۔

شمس العلما مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے تاجران کتب کی زبانی مولوی خدا بخش کے ایسے نادرو روزگار شوق وانہماک علوم وفنون کا احوال سنا تو حیرت زدہ رہ گئے۔ چناں چہ وہ پٹنہ میں واقع ان کی لائبریری کے دیدار کے لیے بے چین ہو اٹھے کیوں کہ وہ خود بھی نادر و کمیاب اور عظیم الشان کتابوں کے دلدادہ وشیدا تھے۔ ان کی اسی وارفتگی شوق نے لکھنؤ میں ایک کباڑی کی دکان سے 'مونس الارواح' جیسی بیش قیمت کتاب خریدنے پر آمادہ کیا۔ آج 'مونس الارواح' دارالمصنفین اعظم گڑھ کی لائبریری کی سب سے قیمتی کتاب ہے۔ یہ کتاب طلائی نقش ونگار کے حسن و جمال کا مرقع ہے، اس کی مصنفہ مغل شہزادی جہاں آرا بیگم ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی کتابوں کے اپنے اسی شوق وانہماک کو لے کر پٹنہ پہنچے۔ پٹنہ میں انھوں نے تین دنوں تک قیام کیا، اپنے اس قیام کے دوران انھوں نے مولوی خدا بخش کی لائبریری سے حتی الوسع اور بساط بھر استفادہ کیا۔ آخر میں انھوں نے اس لائبریری اور بانی لائبریری کے تعلق سے ملاقاتیوں کے رجسٹر (Visit Book) میں اپنے تاثرات یوں پیش کیے:

''ممالک اسلامیہ میں جو مقامات اسلامی تصنیفات کے مخزن سمجھے جاتے ہیں وہ حرمین، قاہرہ، دمشق اور قسطنطنیہ ہیں۔ قاہرہ کے کتب خانوں کی فہرست تین جلدوں میں چھپ کر آئی ہے۔ قسطنطنیہ میں ۹ کتب خانے ہیں۔ حرمین کے کتب خانے ہم نے خود دیکھے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ہندوستان میں بھی چند کتب خانے موجود ہیں۔ اگرچہ ان کتب خانوں کی حیثیتیں اور خصوصیتیں مختلف ہیں اور اس وجہ سے ان کا موازنہ نہیں کیا جاسکتا، تاہم اجمالاً کہا جاسکتا ہے کہ مولوی خدا بخش کا کتب خانہ جس کا اس وقت ذکر کر رہے ہیں اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے روم ومصر وعرب وہند کے نامور کتب خانوں کی صف میں جگہ پانے کے لائق ہے۔ مولوی خدا بخش صاحب نے جس اہتمام اور زر خطیر کے صرف سے کتابیں بہم پہنچائی ہیں ان کی نظیر سے تمام ہندوستان خالی ہے کیا یہ کچھ کم تعجب کی بات ہے کہ ایک معمولی حیثیت کے وکیل جس کے پاس کچھ جائداد نہیں اور جس کی آمدنی صرف ضلع کی وکالت پر محدود ہے ایک کتب خانہ کی تیاری میں ڈیڑھ لاکھ روپے صرف کردے''۔

ہم نے ماقبل سطور میں مولوی خدا بخش خاں کی شریک حیات رضیہ بیگم کا نام لیا تھا، ہم چاہتے ہیں کہ ان کی حالات زندگی پر بھی تھوڑی سی روشنی ڈالتے چلیں۔ ہمارا خیال ہی نہیں بلکہ پختہ یقین بھی ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں اپنی ذاتی کوششوں سے علم و ادب کی دنیا میں جو خصوصی مقام پیدا کرلیا تھا اس سے ہماری قوم کی بیٹیوں کو بڑا حوصلہ ملے گا اور وہ بھی ان کے دکھائے ہوئے راستے پر چل کر قوم و ملک کی گراں قدر خدمات انجام دے سکتی ہیں۔ عام طور پر ایسا دیکھا گیا ہے کہ ہماری قوم کی بیٹیاں سسرالی زندگی کے صدیوں پرانے بندگی و بے چارگی کے فرسودہ خیال کی بندش کے ساتھ زندگی گزارنے کی عادی ہوجاتی ہیں، وہ اس امر کا خیال تک دل میں نہیں لاتی ہیں کہ کس طرح وہ اپنی تخلیقی قوتوں اور صلاحیتوں کو ختم کردینے کے جرم کا ارتکاب کرتی ہیں۔ انھیں اس بات کا پتا نہیں ہوتا کہ خدا ہر شخص کو کسی نہ کسی صلاحیت سے سرفراز کرتا ہے۔ مولوی خدا بخش کی اہلیہ صرف کلام مجید کا ناظرہ اور اردو کی بہت معمولی سی تعلیم حاصل کرکے میکے سے سسرال آئی تھیں۔ انھوں نے بدقسمتی سے وہ زمانہ پایا تھا جب ہندستانی معاشرے میں تعلیم نسواں پر بہت کم توجہ دی جاتی تھی، لیکن اگر مطالعہ اور غور وفکر کا شوق ہو تو خواتین کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرسکتا۔ رضیہ بیگم کو مطالعے کا بے پناہ شوق تھا، انھیں غور وفکر کی بھی عادت تھی چناں چہ شادی کے بعد سسرال میں خانگی ذمہ داریوں کو نبھاتے ہوئے انھوں نے اپنے مطالعے کو بہر صورت جاری رکھا۔

مطالعے کے بعد غور وفکر بھی وہ کرتی رہتی تھیں، اس افضل، سودمند اور تعمیری عادت نے ان کے ذہن کو خراد چڑھنے میں ان کی خاطر خواہ مدد کی۔ عمیق مطالعے نے ان کے ذہن کو کشادگی سے ہمکنار کیا۔ اب وہ اس اہلیت کی مالک بن چکی تھیں کہ تاریخ ادب اردو کے قادرالکلام اور استادانہ حیثیت کے مالک شعرا کے دواوین ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھا کرتیں۔ اس سودمند عادت نے شعر گوئی کی طرف ان کے ذہن کی رہنمائی کی۔ آہستہ آہستہ شعر گوئی کا شغف ان کے اندر ایسا بیدار ہوا کہ مستقل طور پر وہ شعر کہنے لگیں۔ ابتدا میں تو وہ رضیہ کے نام سے شعر کہتی رہیں لیکن بعد میں انھوں نے اپنے نام میں خفیف سی تبدیلی کرکے اسے راضیہ کردیا۔ ان کی شعر گوئی کی صرف دو مثالیں ہم پیش کریں گے، ملاحظہ فرمائیں:

زندگی جب کی ہے امید پر اس کے قائم
راضیہ غیر سے امید کی حاجت کیا ہے

مزاحمت کا دیکھ خاک کو بعد مرے بھی جستجو ہے
ابھی کی گلیوں میں پھر رہا ہے ہر ایک جانب غبار اپنا

آپ یہ جان کر حیرت واستعجاب میں پڑ جائیں گے کہ آہستہ آہستہ ان کے اشعار کی تعداد پانچ ہزار تک پہنچ گئی۔ انھوں نے اپنے پانچ ہزار اشعار پر مشتمل کل آٹھ دواوین مرتب کیے جو قلمی نسخوں کی شکل میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری میں آج بھی محفوظ ہیں۔ محققین اردو کی غلطیوں اور لغزشوں کی گرفت کرنے والے تحقیق کے میدان کے زبردست شہسوار قاضی عبدالودود اور اردو تنقید کے بت شکن نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد نے راضیہ کے کلام کو عیوب سے پاک و صاف بتایا ہے۔

اپنے مطالعے کے شوق کی بنیاد پر انھوں نے فارسی زبان وادب میں بھی اچھی خاصی استعداد پیدا کرلی تھی۔ چناں چہ وہ اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی شعر کہنے لگیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کے آٹھ دواوین تو مرتب کیے ہی، ساتھ ہی ساتھ ایک طویل مثنوی 'احسن المطالب' بھی قلم بند کی، یہ مثنوی بھی مخطوطے کی شکل میں لائبریری میں محفوظ ہے۔ انھوں نے اپنی خودنوشت سوانح عمری بھی سپرد قلم کی تھی۔ اپنے آٹھ دواوین، ایک مثنوی 'احسن المطالب' اور خودنوشت سوانح عمری کو خوش خطی کا پیرہن خود انھوں نے ہی عطا کیا تھا۔ ان کے شوہر مولوی خدا بخش مرحوم جو خود بھی شاعر تھے اور جمیل تخلص کرتے تھے، اسی مناسبت سے راضیہ نے اپنا تخلص آخر آخر میں جمیلہ اختیار کرلیا تھا۔ زندگی کی آخری گھڑیوں میں وہ اردو کے مشہور استاد شاعر شاد عظیم آبادی کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہوگئی تھیں۔ ان کا کلام دیکھنے کے بعد شاد عظیم آبادی نے بھی یہ رائے دی تھی کہ راضیہ کا کلام ہر طرح کے سقم اور نقص سے پاک ہے۔ تو یہ تھیں رضیہ عرف راضیہ عرف جمیلہ جو اپنے شوق، لگن اور مساعی جمیلہ سے اردو اور فارسی کی ایک قادرالکلام شاعرہ کا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری میں ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے بہت سے زرق برق قلمی نسخے ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کرچکے ہیں کہ اکتوبر ۱۸۹۱ میں مولوی خدا بخش نے اورینٹل پبلک لائبریری کی بنیاد رکھی۔ اس سلسلے میں ہم یہ بھی بتادیں کہ لائبریری کی بنیاد رکھنے سے پہلے خدا بخش نے لائبریری کی عمارت تعمیر کروائی۔ جب عمارت کی تعمیر کا کام بہ خوبی انجام پاگیا تو کتابیں جو جمع کی جاچکی تھیں اس میں سلیقے سے رکھوادی گئیں۔ اس وقت تک لائبریری میں کئی ہزار قلمی نسخے اور اتنی ہی مطبوعہ کتب تھیں، پھر ۲۳ نومبر ۱۸۹۱ کو لائبریری کی اسی عمارت میں ایک جلسہ ہوا، اس جلسے کے پریسیڈنٹ نواب احمد تھے۔ اس جلسے میں شہر کے دوسرے بڑے بڑے امرا اور عمائدین بھی شریک تھے۔ اس وقت جلسے میں ایک تجویز پیش رکھی گئی کہ لائبریری کو پبلک لائبریری کا درجہ فراہم کیا جائے۔ اس کی روداد ۵ دسمبر ۱۸۹۱ کو پٹنہ گزٹ میں شائع کی گئی۔ 'الپنچ' اخبار نے بھی اس وقت یہ خبر شائع کی کہ مولوی خدا بخش نے اپنے والد محمد بخش کی وصیت کے عین مطابق لائبریری کو پبلک لائبریری کا درجہ دلوایا۔ خدا بخش مرحوم نے لائبریری کو وقف کرنے کا خیال سب سے پہلے کیمبل صاحب قائم مقام کمشنر کے گوش گزار کیا، جس جلسے میں لائبریری کو وقف کرنے کی قرارداد پیش ہوئی اس جلسے میں اسٹوارٹ بیلی صاحب لیفٹننٹ گورنر بہار بھی موجود تھے، اس وقت انھوں نے لائبریری کو مبلغ چھ روپے سالانہ دینے کا وعدہ کیا لیکن اس سے پہلے انھوں نے یہ شرط رکھی کہ پہلے کتب خانے کے لیے مبلغ پندرہ ہزار روپے کی رقم جمع کی جائے۔ چناں چہ اس فیصلے کے عین مطابق جلسے میں جو لوگ اس وقت جمع تھے ان سے تعاون کی درخواست کی گئی، اس درخواست پر عمل کرتے ہوئے لوگوں نے چندہ ہزار روپے کا عطیہ آنا فانا میں اکٹھا کرکے جمع کردیا۔ اس طرح ۲۳ نومبر ۱۸۹۱ کو اورینٹل لائبریری کو اورینٹل پبلک لائبریری کا درجہ حاصل ہوگیا۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ مولوی خدا بخش مرحوم نظام حیدرآباد کی فرمائش پر ان کی ریاست کے چیف جسٹس کے عہدے پر متمکن ہوئے لیکن تین سال بعد وہ پٹنہ واپس آگئے تھے، یہاں انھوں نے پھر سے وکالت شروع کی لیکن بدقسمتی سے کورٹ میں ہی ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا، اسی حالت میں انھیں ان کے گھر لایا گیا، اب وہ بالکل معذور ہوچکے تھے۔ چلنا پھرنا ان کا بالکل موقوف ہوگیا۔ انگریز حکومت نے ان کی دستگیری کی، دوا علاج میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی گئی لیکن ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'' کے مصداق انھوں نے انتہائی کس مپرسی میں زندگی کے باقی دن گزارے۔ بالآخر ۳ اگست ۱۹۰۸ کو وہ گھڑی آن پہنچی جب ان کی جان قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔

۱۹۴۷ کے بعد بھی حکومت ہند نے جن ہندستانی کتب خانوں کو اپنی تحویل میں رکھا ان میں اورینٹل پبلک لائبریری بھی شامل ہے۔ اس لائبریری کے سامنے مالی وسائل کا مسئلہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہر سال وافر تعداد میں سرکاری خرچ اور صرف سے کتابیں خریدی جاتی ہیں، اب تک اس لائبریری میں پچاس ہزار سے زیادہ مطبوعہ کتابیں جمع ہوچکی ہیں۔ یہاں پر عربی، فارسی اور ترکی کے تقریباً اکیس ہزار مخطوطے ہیں۔ علم جراحی، ہیئت، ریاضی، فن حدیث اور فلسفہ وحکمت وغیرہ کے موضوعات پر نادر وکمیاب کتابیں اس لائبریری کی زینت بڑھا رہی ہیں۔ جنوری ۱۹۷۸ سے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کا رسالہ 'خدا بخش لائبریری جرنل' کے نام سے شائع ہورہا ہے۔ اس رسالے کی پہلی مجلس ادارت کے چیئرمین قاضی عبدالودود صاحب تھے، اس کے اراکین میں سید حسن عسکری، افسرالدولہ اور فیاض الدین حیدر شامل تھے اور عابد رضا بیدار صاحب اس کے سکریٹری تھے۔ اس لائبریری کا شمار ہندستان کی بہترین لائبریریوں میں ہوتا ہے۔ اس کا کیٹلاگ بہت سائنٹفک طریقے سے مرتب کیا گیا ہے۔ ملک کے کونے کونے سے لوگ یہاں آتے ہیں اور لائبریری کے بہتر انتظامات کو دیکھ کر خوشی اور طمانیت کا اظہار کرتے ہیں۔ محققین کے لیے تو یہ لائبریری کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ خدا اسے ہر زمانے میں دشمنوں کے شر اور سازش سے محفوظ رکھے اور ہمیں بھی اس کی حفاظت کا صالح جذبہ عطا فرمائے۔

●●●

اردو دُنیا

اردو میڈیم اسکولوں کی تعداد میں اضافے کی ہدایت

انگریزی میڈیم اسکولوں میں اردو کا مضمون شامل کیا جائے

——— سکریٹری اقلیتی بہبود کی ہدایت

حیدرآباد (۲۳/جولائی)۔ اردو میڈیم اسکولوں میں طلبہ کی تعداد میں اضافہ اور انگریزی میڈیم اسکولوں میں کم از کم ایک مضمون کے طور پر اردو پڑھانے کے اقدام کرنے کے لیے سکریٹری محکمہ اقلیتی بہبود جناب احمد ندیم نے آج اردو اکیڈمی اور مرکز تعلیمی ترقی برائے اقلیتیں (سی ای ڈی ایم) کے جائزہ اجلاس میں ہدایت دی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ایس اے شکور (ڈائرکٹر سکریٹری اردو اکیڈمی)، کمشنریٹ اقلیتی بہبود کے او ایس ڈی ولاور علی اور دونوں اداروں کے عہدیدار موجود تھے۔ جناب احمد ندیم نے سکریٹریٹ میں اردو اکیڈمی اور سی ای ڈی ایم کا ایک جائزہ اجلاس منعقد کرتے ہوئے کہا کہ اردو میڈیم اسکولوں میں طلبہ کی تعداد میں اضافے کا میکانزم تیار کیا جائے۔ اس سلسلے میں مختلف محکموں کے درمیان تعاون و اشتراک کی ضرورت بھی ہو تو اس پر موثر طریقے سے عمل آوری کی جائے۔ انھوں نے کہا کہ انگریزی میڈیم اسکولوں میں بطور ایک مضمون اردو کی تعلیم کے انتظام کے لیے اردو اکیڈمی محکمہ ثانوی تعلیم کے ساتھ اقدام کرے۔ طلبہ کو اردو زبان میں تعلیم کے لیے راغب کرنے کے اسکیم تیار کی جائے۔ جناب احمد ندیم نے کہا کہ اردو نصابی کتب کی طباعت اردو اکیڈمی کے ذریعے ہونی چاہیے تاکہ اس کام کے لیے دیگر اداروں پر انحصار کرنے کی نوبت نہ آئے۔ سکریٹری محکمہ اقلیتی بہبود نے مزید کہا کہ ریاست بھر میں حکومت کے جو شادی خانے ہیں انھیں اردو کی سرگرمیوں کے لیے بھی استعمال کیا جانا چاہیے۔ انھوں نے مرکز تعلیمی ترقی برائے اقلیتیں (سی ای ڈی ایم) کی کارکردگی کا جائزہ لیا اور کہا کہ ریاست میں اقلیتوں کی آبادی کے تناسب سے ضرورت ہو تو اس کے مراکز میں اضافہ کیا جائے تاکہ اقلیتی طلبہ تعلیمی میدان میں مسابقت کرسکیں۔ جناب احمد ندیم نے کہا کہ طلبہ کی تعداد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک ضلع میں ایک سے زائد مراکز بھی قائم کیے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے سی ای ڈی ایم کے استحکام کے لیے مرکز سے فنڈس کے حصول کی ہدایت دی اور کہا کہ اس سلسلے میں ریاستی حکومت بھی سفارش کرے گی۔ (اعتماد۔ حیدرآباد)

جموں وکشمیر میں اردو کے فروغ کے لیے کونسل قائم ہوگی

سری نگر (۳۰/جولائی)۔ جموں وکشمیر کی حکومت ریاستی کونسل برائے فروغ اردو زبان قائم کرے گی، جس کا مقصد ریاست کی سرکاری زبان اردو کو جامع ترقی اور فروغ دینا ہے۔ ایک سرکاری ترجمان نے آج یہاں بتایا کہ جموں وکشمیر کونسل برائے فروغ اردو زبان کے قیام کے سلسلے میں سب کمیٹی کی سفارشات پر ایک اعلا سطحی کمیٹی غور کرے گی۔ ٹورزم اور کلچر محکمے کے تحت ایک کمیٹی تشکیل کی گئی تھی جسے ریاست میں اردو اکادمی کے قیام اور ریاست میں اردو کے فروغ سے متعلق کونسل قائم کرنے کے سلسلے میں غور وخوض کرکے تجویز پیش کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ کمیٹی کی طرف سے پیش کردہ تجویز کے مطابق ریاستی اردو کونسل ایک خود مختار ادارہ ہوگا جس کے سربراہ وزیر اعلا عمر عبداللہ ہوں گے، جب کہ اس کے دیگر اراکین میں اردو ادب و ثقافت سے تعلق رکھنے والے افراد کے علاوہ وزیر ثقافت بھی ہوں گے۔

(سالار۔ بنگلور)

بہار میں 27 ہزار اردو اساتذہ کی تقرری ہوگی - پی۔ کے۔ شاہی

ارریہ بہار (۷/اگست)۔ جے ڈی یو کارکنان کا ایک روزہ اجلاس جوگی ہاٹ مدرسہ اصلاح العلوم کے احاطے میں منعقد ہوا۔ اس میں بڑی تعداد میں جے ڈی یو کے سینئر لیڈران و کارکنان شامل تھے۔ کانفرنس کی صدارت ایم ایل اے سرفراز عالم نے کی جب کہ نظامت کے فرائض ضلع صدار اسعد راہی نے ادا کیے۔ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے وزیر تعلیم پی کے شاہی نے کہا کہ ریاست میں 27 ہزار اردو اساتذہ کی تقرری کی جائے گی۔ ساتھ ہی مدرسوں کے حالات بھی بہتر بنائے جائیں گے۔ 206 مدرسوں کو منظوری مل گئی ہے اور مزید ایک ہزار مدرسوں کو منظوری دیے جانے کا منصوبہ ہے۔ اس کے علاوہ 2400 مدرسوں کو جب منظوری دی جائے گی۔ ایم ایل اے سرفراز عالم نے کہا کہ نتیش کمار کے دور میں بہار میں ترقی ہوئی ہے، یہ پوری دنیا کے سامنے ہے۔ کانفرنس سے ایم ایل اے ڈاکٹر اظہار احمد نے بھی خطاب کیا۔ انھوں نے کہا کہ بہار میں سماجی انصاف کے ساتھ ترقی کی راہیں ہموار کی جارہی ہیں۔ نتیش کمار نے بھی فرقہ، طبقہ اور مذہب کے لوگوں کو متحد کرنے کا کام کیا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد سے ہی ترقی اور خوش حالی ممکن ہے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

بزم اردو ناگپور کی ادبی نشست

ناگپور (ڈاک سے)۔ ناگپور میں کالج کے اردو، عربی اور فارسی کے اساتذہ کے ادبی ذوق و شوق کی تکمیل کی غرض سے گزشتہ دنوں ایک ادبی انجمن بزم اردو ناگپور کا قیام عمل میں آیا۔ بزم کا بنیادی مقصد ادبی نشست کا انعقاد اور ایک ادبی جریدے کا اجرا ہے۔ اس سلسلے کی ایک کڑی کے طور پر گزشتہ دنوں ۲۸/جولائی کو ایک نشست منعقد ہوئی تھی، جس میں مختلف کالجوں کے اساتذہ کرام نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ نشست کی صدارت ناگپور یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے چیئرمین ڈاکٹر اظہر حیات نے کی، جب کہ ایل۔ اے۔ ڈی کالج سے پروفیسر ریشمہ تزئین نے اپنا مقالہ 'معاشرے کی فلاح و بہبود میں قومی یکجہتی کی اہمیت' پیش کیا۔ اس کے بعد ایس۔ کے۔ پوروال کالج سے ڈاکٹر اظہر ابرار نے اپنا مقالہ بعنوان 'ابن صفی: شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق' پڑھا۔

آخر میں صدر محفل نے بھی اپنا مقالہ 'سید یونس، منفرد لب و لہجے کے جدید شاعر' پڑھا جس میں انھوں نے پروفیسر سید یونس مرحوم کی زندگی پر روشنی ڈالی۔ نظامت کے فرائض پروفیسر محمد اسرار نے انجام دیے۔ اس بزم میں ڈاکٹر انجم آرا، ڈاکٹر ناہید سورتی، ڈاکٹر سیمہ خورشید اور سمیرہ مومن کے علاوہ دیگر اساتذہ نے بھی شرکت کی۔

(پریس ریلیز بزم اردو ناگپور)

اردو بی اے اور بی ایڈ کے ساتھ ناانصافی

ہزاروں امیدوار ٹیچر بننے سے محروم

فیروزآباد، یوپی (۱۵/جولائی)۔ گزشتہ ۲۷/اور ۲۸/جون کو ٹی ای ٹی کا امتحان لیا گیا، اس میں اردو کے ساتھ بی اے اور بی ایڈ کرنے والے طلبہ کو امتحان دینے کی اجازت نہیں دی گئی جب کہ انگریزی اور سنسکرت میں بی اے اور بی ایڈ کرنے والوں کو ٹی ای ٹی کے امتحان کے لیے مستحق ٹھہرایا گیا۔ اقلیتوں اور خاص طور پر اردو حلقے میں اس ناانصافی پر کافی غم و غصہ ہے۔ ریشیاں پبلک اسکول کے مہتمم محمود انور نے کہا کہ جب زبان کے اساتذہ کی تقرری میں سنسکرت اور انگریزی میں بی اے کے ساتھ بی ایڈ کرنے والوں کو ٹی ای ٹی کا امتحان دینے کے لیے مستحق مانا جارہا ہے تو اردو والوں کے ساتھ الگ سلوک کیوں کیا جارہا ہے۔ ہندستان کے آئین میں تمام ہندستانیوں کو یکساں حق حاصل ہے، تو پھر مسلمانوں اور خاص طور پر اردو والوں کے ساتھ یہ الگ اصول و ضوابط کیوں اختیار کیے جارہے ہیں؟ اس ناانصافی کی وجہ سے اردو کے ساتھ بی اے اور بی ایڈ کرنے والے ہزاروں طلبہ کی اردو ٹیچر بننے کی امیدوں پر پانی پھیر دیا گیا ہے۔ (انقلاب۔ دہلی)

قطب اللہ پور میں سرکاری اردو میڈیم اسکول کا سنگ بنیاد

حیدرآباد (۳/جولائی)۔ حلقہ اسمبلی قطب اللہ پور کے چنل ڈویژن کے گاندھی نگر علاقے میں آج مقامی ایم ایل اے کونا سری سیم گوڑ کے ہاتھوں اردو میڈیم گورنمنٹ اسکول کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ سری سیم گوڑ نے اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ حلقہ اسمبلی قطب اللہ پور میں اردو والوں کی خاصی تعداد ہے اس کے باوجود یہاں اردو میڈیم اسکول کی کمی پائی جارہی ہے، اس لیے اردو میڈیم کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی سہولت کی خاطر اسکول کا قیام عمل میں لایا جارہا ہے۔ اس اردو میڈیم اسکول کی تعمیر کی وجہ سے یہاں کے اردو داں طبقے کا دیرینہ خواب پورا ہوگا۔ اس موقعے پر مقامی کارپوریٹر راج شیکھر گوڑ اور دائی ایس آر کانگریس کے دیگر قائدین موجود تھے۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

خواجہ معین الدین چشتی اردو، فارسی، عربی یونیورسٹی میں اعلا ریسرچ اور بازار کی ضرورتوں کو مرکزی حیثیت دی جائے

لکھنؤ (۱۸/اگست)۔ یونیورسٹی میں اعلا ریسرچ اور بازار کی ضرورتوں کو مرکزی حیثیت دی جانی چاہیے، بغیر اعلا ریسرچ کے ایجادات اور اختراعات کو شروع کرنا مشکل ہے اور بازار کی ضرورت کو ذہن میں رکھے بغیر کسی بھی کورس کو برقرار رکھنا مشکل ہے۔ ان خیالات کا اظہار خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی میں منعقد اورینٹیشن پروگرام میں وزیر مملکت برائے دیہی ترقیات اروند سنگھ گوپ نے کیا۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر انیس انصاری نے بتایا کہ یونیورسٹی میں بین المذاہب تحقیقات اور تصوف کے لیے ریسرچ سینٹر قائم کیا جائے گا۔ جدید ہندستانی زبانوں کے تقابلی مطالعے کے کورسیز چلائے جائیں گے اور اردو بولنے والے طبقے کے سماجی اور تعلیمی مسائل پر ریسورس سینٹر قائم کیا جائے گا۔ کورسیز کی تشکیل اس طرح کی گئی ہے کہ سول سروسز کے امتحان کی تیاری میں آسانی مدد مل سکے۔ سول سروسز کی تیاری کے لیے ٹریننگ سینٹر بھی قائم کیا جائے گا جس کی تجویز منظوری کے لیے حکومت کو بھیج دی گئی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ یونیورسٹی میں پہلا تعلیمی سیشن ۱۹/اگست سے شروع ہونے جارہا ہے۔ اس کی تیاری کے سلسلے میں طلبہ و طالبات اور اساتذہ کے ساتھ گفتگو کی گئی۔ 528 طلبہ اور طالبات کے داخلہ فارم بھیج پائے گئے جن میں سے 346 نے 16 کورسیز میں فیس جمع کرکے داخلہ لے لیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ یونیورسٹی میں اردو کی پڑھائی بھی کورسیز میں لازمی ہے۔ انگریزی مضبوط کرنے کے لیے کلاسیز چلائی جائیں گی۔ 27

چندانگر میں اردو میڈیم اسکول کا کوئی پرسانِ حال نہیں

ایک بھی استاد نہیں، 319 طلبہ کا مستقبل تاریکی کی نذر

سیری لنگم پلی، آندھرا پردیش (۱۳ر اگست)۔ اپر پرائمری اسکول (اردو میڈیم) چندانگر ضلع رنگا ریڈی جہاں 319 طلبہ زیر تعلیم ہیں، اساتذہ کے بغیر ہی کام کر رہا ہے جس سے وہاں زیر تعلیم طلبہ کے مستقبل کے تاریک ہونے کا اندیشہ ہے۔ تفصیلات کے بموجب حیدرآباد۔ ممبئی شاہراہ نمبر ۹ سے متصل ایم کے چندانگر، سیری لنگم پلی منڈل ضلع رنگا ریڈی گورنمنٹ اسکول کے احاطے میں اردو میڈیم کی اول تا آٹھویں متوازی جماعتیں گزشتہ کئی برسوں سے چل رہی ہیں جہاں غریب اور مزدور پیشہ افراد کے بچے زیر تعلیم ہیں، ان میں اکثریت طالبات کی ہے۔ مذکورہ اردو میڈیم اسکول بغیر کسی مدرس کے گزشتہ ڈیڑھ سال سے کام کر رہا ہے۔ حکام سے اردو اساتذہ کے تقررات کے لیے متعدد بار نمائندگیاں کی گئیں مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوسکا۔ منتخب عوامی نمائندوں، رکن اسمبلی اور متعلقہ کارپوریٹر سے بھی اس مسئلے کو رجوع کیا گیا لیکن یہ بھی بے فیض ثابت ہوا ہے۔ تعلیمی سال کا آغاز ہوئے تقریباً تین ماہ کا عرصہ گزر چکا ہے مگر ابھی تک کسی مدرس کا تقرر عمل میں نہیں لایا گیا۔ فی الوقت ایک معلم ہی برسر کار ہے جن کا تمام طلبہ کو پڑھانا ناممکن ہے۔ اساتذہ کے نہ ہونے سے طلبہ اسکول آکر کھیل کود میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ ایم ای او سیری لنگم پلی مسز شکریا سے ربط پیدا کیا گیا تو وہ پہلے بات کرنے سے کتراتے رہے تاہم بعد میں انھوں نے صرف اتنا کہا کہ اگر کوئی امیدوار دستیاب ہوا تو اس پر غور کیا جائے گا۔ ان کے اس لاپرواہ رویے پر طلبہ کے سرپرستوں نے سخت احتجاج کرتے ہوئے دھرنا بھی دیا۔ انھوں نے متعلقہ حکام سے مطالبہ کیا کہ وہ نونہالوں کے مستقبل کا خیال کرتے ہوئے مزید کسی تاخیر کے بغیر اساتذہ کا انتظام کریں بصورت دیگر طلبہ کے سال ضائع ہونے کے وہی ذمہ دار ہوں گے۔ انھوں نے چیئرمین ریاستی اقلیتی کمیشن سے بھی اس سلسلے میں دل چسپی لینے اور اردو اساتذہ کا انتظام کرنے کی خواہش کی ہے۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

گورنمنٹ بوائز ہائی اسکول اردو میڈیم بوئن پلی کو بند کرنے کی متعصبانہ سازش

حیدرآباد (۸ر جولائی)۔ سکندرآباد کے علاقے ماریڈ پلی منڈل میں اردو میڈیم اسکول کو بند کرنے کی سازش کی جارہی ہے۔ ماریڈ پلی منڈل کے گورنمنٹ بوائز ہائی اسکول بوئن پلی اردو میڈیم میں ہر سال طلبہ کی تعداد میں کمی ریکارڈ کی جارہی ہے۔ اس وقت گورنمنٹ بوائز ہائی اسکول بوئن پلی کی پانچ جماعتوں میں محض ۱۸ طلبہ زیر تعلیم ہیں جب کہ جی پی ایس بوئن پلی میں 69 طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس اسکول میں فزیکل سائنس مضمون کے ٹیچر کی ایک اسامی خالی ہے جب کہ جی پی ایچ ایس بوئن پلی میں سکنڈری گریڈ ٹیچرس کی جملہ 6 کے 4 اسامیاں خالی ہیں۔ جی ایچ ایس بوئن پلی سے وابستہ ایک خاتون ٹیچر نے بتایا کہ ۲۰۰۷ میں اس اسکول کی قدیم عمارت میں تقریباً 200 طلبہ زیر تعلیم تھے۔ لیکن اس اسکول کو نئی عمارت میں منتقل کرنے کے بعد طلبہ کی تعداد میں تشویشناک حد تک کمی ریکارڈ کی گئی ہے۔ اس اسکول کی عمارت میں 25 روم تعمیر کیے گئے ہیں لیکن جی ایچ ایس بوئن پلی کی صدر مدرس صاحبہ نے چستا کاری سے اردو میڈیم ہائی و پرائمری اسکول کو صرف تین کمرے ہی الاٹ کیے ہیں۔ جی ایچ ایس بوئن پلی کے طلبہ نے ہمیں بتایا کہ اس اسکول کے اساتذہ بالخصوص صدر مدرس صاحبہ اسکول وقت پر آنے کی زحمت بھی نہیں کرتے ہیں۔ اسکول کے ایک طالب علم نے بتایا کہ صدر مدرس صاحبہ ہی ایک ہفتے میں صرف ایک یا دو دن ہی اسکول میں حاضر ہوتی ہیں اور کچھ دیر بعد واپس لوٹ جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اساتذہ کی خالی اسامیوں پر تقرری میں لاپرواہی سے بھی طلبہ دوسرے اسکولوں میں داخلوں کو ترجیح دے رہے ہیں۔ محمد نثار نامی ایک مقامی شخص نے بتایا کہ بوئن پلی بوائز ہائی اسکول اردو میڈیم میں فیروز گوڑہ، گوتم نگر، حسن لائن، بالاجی نگر، اولڈ بوئن پلی کے علاوہ دیگر علاقوں سے تعلق رکھنے والے غریب طلبہ زیر تعلیم ہیں، لیکن اسکول انتظامیہ کی لاپرواہی اور اعلا حکام کی کاہلی کے سبب اس اسکول میں طلبہ کی تعداد میں کمی ریکارڈ کی جارہی ہے۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

مختصر مدتی سرٹیفکٹ اور ڈپلوما کورسیز بھی چلائے جائیں گے جو بازار کے مطالبے کو ذہن میں رکھ کر بنائے گئے ہیں۔ اب تک 30 اساتذہ کام کر رہے ہیں۔ اس موقعے پر پروفیسر وزیر اعزاز حسین، رجسٹرار اشوک کمار، فائنس افسر ایس سی سنگھ، اور ایس ڈی ڈاکٹر جی آر یادو کے علاوہ تمام اساتذہ بھی موجود تھے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

سرکاری دفاتر میں اردو بورڈ نہ ہونے سے عوام پریشان

کشن گنج، بہار (۲۵ر جولائی)۔ ریاست بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہونے کے کئی دہائی گزر جانے کے بعد بھی اردو کو اپنا حق نہیں ملا۔ کشن گنج کے زیادہ تر سرکاری دفاتر کے بورڈ اردو میں نہ لکھے ہونے سے اردو پڑھنے والوں کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اردو میں درخواست دینے پر معمولی کارروائی نہیں ہوتی۔ اردو ٹرانسلیٹر، معاون ٹرانسلیٹر اور اردو ٹائپسٹوں کو دوسرے کاموں میں لگائے جانے پر ضلع اردو ترقی آرگنائزر کے صدر محمد یونس نے نمائندہ کو مزید جانکاری دیتے ہوئے بتایا کہ کشن گنج ضلع میں کل سترہ اردو ٹائپسٹ، ٹرانسلیٹر، معاون ٹرانسلیٹر ساتوں بلاک و ضلع کے سول ایس ڈی او کے یہاں مامور ہیں حالاں کہ سات سیٹیں ابھی بھی خالی پڑی ہیں۔ اس کے علاوہ اردو کے جو ملازم ریٹائر ہوگئے یا پھر ان کی موت ہوگئی ان سیٹوں پر اب تک کسی کی بحالی نہیں ہوئی۔ ٹرانسلیٹر محفوظ عالم نے 'انقلاب' کے چیف بیورو خورشید ہاشمی کی رپورٹ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ۱۸ر جولائی کو 'انقلاب' میں اردو کی حالِ زار کا جو ذکر کیا ہے وہ سو فیصد سچ ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مرکزی و صوبائی حکومت اردو کی ترقی کے لیے جو منصوبہ بناتی ہے اور فنڈ مہیا کراتی ہے وہ کہاں چلے جاتے ہیں، اردو کی ترقی تو نہیں ہوتی البتہ کچھ مفاد پرستوں کی ترقی ضرور ہو رہی ہے۔ گزشتہ دنوں ایم ایل اے اختر الایمان نے بہار اسمبلی میں اس سوال کو اٹھایا تھا لیکن [illegible] نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ تمام بحال اردو ٹرانسلیٹر و ٹائپسٹوں سے دوسرے کام نہیں کرائے جاتے۔ 70 فیصد اقلیتی آبادی والا ضلع ہونے کے باوجود اردو کی ترقی تو دور یہاں مختلف سرکاری دفاتر میں اردو سائن بورڈ تک نہیں۔ آخر میں محمد یونس نے کہا کہ اردو کی ترقی کے لیے ریاستی پیمانے پر تحریک چلائی جائے گی۔ ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا کے بعد کسی بھی وزیر اعلا نے اردو کے فروغ کے لیے کوئی بھی اقدام نہیں کیا۔ اس بارے میں دیگر مقامی افراد نے بھی سخت ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اب جب کہ بہار کی حکومت فرقہ پرستوں کے دباؤ سے آزاد ہوگئی ہے، اسے چاہیے کہ اردو کے فروغ کے لیے وعدہ نہیں بلکہ عملی اقدام کرے۔

(انقلاب۔ دہلی)

حلقۂ اربابِ ذوق چینئی کی ادبی نشست

چینئی (ڈاک سے)۔ حلقۂ اربابِ ذوق کی ادبی اور شعری نشست سید سلطان باشا (مالک عذرا پریس، چینئی) کے دفتر پر منعقد کی گئی۔ اس نشست کی صدارت مشہور ادیب و شاعر علیم صبا نویدی صاحب نے فرمائی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر حیات افتخار (سکریٹری حلقۂ اربابِ ذوق) نے انجام دی۔ صدارتی کلمات میں علیم صبا نے کہا کہ آج مشاعروں میں عام طور پر وہ شاعر کامیاب نہیں ہوتے جو کتابوں اور رسائل میں چھپتے رہتے ہیں، اس لیے، مشاعروں کے معیار کو بلند کرکے اعلا ادبی معیار کے حامل شاعروں کا رشتہ مشاعروں سے جوڑنا چاہیے۔ امان اللہ امان نے کہا کہ آج مشاعروں میں وہی شاعر کامیاب ہوتے ہیں جو ترنم سے اپنا کلام پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر حیات افتخار نے کہا کہ مشاعروں کے سامعین کا ذوق اب اتنا معیاری نہیں رہا ہے جس کا ایک سبب اردو زبان کی تعلیم بالخصوص اردو میڈیم (ذریعۂ تعلیم) کی کمی ہے۔ مشاعروں کے معیار بلند کرنے کے لیے اردو تعلیم کے معیار کو بلند کرنا ہوگا۔ اس نشست میں ڈاکٹر حیات افتخار نے علیم صبا نویدی کے غزلوں کے مجموعے 'عرشِ غزل' پر تبصراتی مضمون بھی پیش کیا۔ شعری نشست کی ابتدا میں علیم صبا نویدی نے نثری نظموں کی صورت میں دو چار نعتوں کا نذرانہ پیش کیا۔ علیم صبا نویدی کے بعد وفا عظمی، سراج دولت مدراسی، شاہد مدراسی، امان اللہ امان اور سید سلطان باشا سلطان نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

(پریس ریلیز حلقۂ اربابِ ذوق چینئی)

اردو میڈیم کی نصابی کتب ہنوز ندارد

نئی دہلی (۲۶ر جولائی)۔ اسکولوں میں نئے تعلیمی سال کے تحت پڑھائی کا سلسلہ شروع ہوئے چار ماہ کا عرصہ گزر چکا ہے مگر اردو میڈیم اسکولوں میں ابھی تک اردو میں تمام نصابی کتاب دستیاب نہیں ہیں اور نہ ہی اس سلسلے میں این سی ای آر ٹی کوئی خاطر خواہ جواب دے سکی ہے۔ اردو میڈیم کی نصابی کتب کے نہ ہونے سے بچوں کا مستقبل داؤ پر لگ گیا ہے اور اساتذہ پر اضافی بوجھ پڑ گیا ہے۔ ذرائع کے مطابق سب سے زیادہ سینئر سیکنڈری اسکولوں میں آرٹس اسٹریم میں پڑھنے والے بچے پریشان ہیں کیوں کہ ابھی تک ہسٹری، سیاسیات اور جغرافیہ کی اردو میڈیم کی کتابیں مارکیٹ میں دستیاب نہیں ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ چھٹی سے دسویں کلاس تک کی کتابیں تو اردو میں پھر بھی دستیاب ہیں مگر گیارہویں اور بارہویں کلاس کی کتابیں ابھی تک مارکیٹ میں نہیں آئی ہیں۔ اس سلسلے میں دہلی سرکار کے ادارے دہلی ٹیکسٹ بیورو (ڈی ٹی بی) نے بھی جو این سی ای آر ٹی کی کتابیں شائع کرتا رہا ہے، ابھی تک اس طرف توجہ نہیں دی ہے۔ ایک سینئر ٹیچر محمد اجمل نے بتایا کہ انھوں نے اردو نصابی کتاب کی فراہمی کے سلسلے میں کئی بار این سی ای آر ٹی کے ذمہ داران سے ملاقات کی، مگر انھوں نے کوئی معقول جواب نہیں دیا اور ہر بار یہی کہا کہ پندرہ بیس دن میں اردو کی کتابیں فراہم کرا دی جائیں گی مگر اب اسکول کھلے ہوئے چار ماہ کا عرصہ گزر چکا ہے مگر اردو کی نصابی کتب ابھی تک بچوں کو نہیں مل پائی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اس سلسلے میں اردو اکادمی دہلی سے بھی رابطہ کیا مگر کوئی راہ نہیں نکل سکی۔ محمد اجمل نے تجویز پیش کی کہ این سی ای آر ٹی اگر نصابی کتب وقت پر دستیاب کرانے کا اہل نہیں ہے تو حکومت کے دیگر اداروں کی طرح کتابوں کی اشاعت کا کام بھی کسی دوسرے کے ہاتھوں میں دے دینا چاہیے یا پھر کسی این جی او کے سپرد کر دینا چاہیے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اک دیا اور بجھا

حیدرآباد۔ اردو کے ممتاز صحافی، ادیب اور جدید لب و لہجے کے شاعر جناب حسن فرخ کا ۱۴ر جولائی ۲۰۱۳ کو مہاویر ہاسپٹل، ماساب ٹینک میں انتقال ہوگیا۔ وہ گزشتہ چند دنوں سے طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے گھر پر آرام کر رہے تھے، لیکن انھیں سینے اور سانس کی تکلیف کی شکایت پر ہاسپٹل لے جایا گیا جہاں انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ جناب حسن فرخ کا شمار اردو کے ممتاز اور بے باک صحافیوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی حیات میں کئی کتابیں لکھیں، شعرا میں بھی ان کی ایک منفرد شناخت تھی۔ انھوں نے اپنی آخری سانس تک اردو زبان و ادب کی خدمت کی۔ جناب حسن فرخ گزشتہ 30 سال سے زائد عرصے سے روزنامہ 'رہنمائے دکن' سے وابستہ تھے۔ ان کی نماز جنازہ ۱۵ر جولائی کو بعد نماز تراویح جامع مسجد ہمایوں نگر میں ادا کی گئی اور تدفین قبرستان درگاہ حضرت سید احمد بادپا فرسٹ لانسر میں عمل میں آئی۔ مرحوم کے پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ تین بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہیں۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام رسالہ: ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد
(نصرت ظہیر نمبر)
مدیر : ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال
اشاعت: اپریل ۲۰۱۳ء (جلد ۴۶، شمارہ ۴)
ناشر : ماہنامہ شگوفہ
۱۰-۳-۱۷۲/۸۲/۱۷ اے/۱،
اویسی پورا، معصب ٹینک،
حیدرآباد- ۵۰۰۰۲۸
ضخامت : ۱۸۲ صفحات
قیمت : ۵۰ روپے
تبصرہ نگار: دیپک بدکی
deepak.budki@gmail.com

اردو ادب میں طنز و مزاح کو پروان چڑھانے میں کئی ادیبوں کا ہاتھ رہا ہے جیسے رتن ناتھ سرشار، جعفر زٹلی، عظیم بیگ چغتائی، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، کنہیا لال کپور، فکر تونسوی، شفیق الرحمن، مشتاق یوسفی، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، دلیپ سنگھ وغیرہ۔ اسی کارواں کے ایک اہم رکن نصرت ظہیر ہیں (عورت ہوتی تو اب تک میر کارواں بن چکی ہوتی!)۔ ان کا اصلی نام ظہیر احمد ہے۔ سکندرآباد، بلند شہر، یوپی میں ۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو پیدا ہوئے، گریجویشن کرکے بہ سلسلہ روزگار دہلی کی راہ اختیار کی اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ پہلا مضمون 'یوجنا' میں چھپا۔ پھر کئی اخبارات سے منسلک رہے مثلاً ملاپ، تیج، قومی آواز، اخبار مشرق، عالمی سہارا وغیرہ۔ اس کے بعد خود اپنا رسالہ 'ادب ساز' شائع کیا اور آج کل قومی اردو کونسل نئی دہلی سے وابستہ ہیں۔ طنزیہ کالم نگاری کے علاوہ کارٹوننگ بھی کرتے رہے۔ علاوہ ازیں ریڈیو اور ٹی وی کے پروگراموں میں شرکت کی اور ٹی وی کے لیے ڈاکیومنٹری اور سیریل بھی لکھے۔ اب تک ان کی کئی تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ نام یوں ہیں: تحت اللفظ، بقلم خود، خراٹوں کا مشاعرہ، لمی واشم، ابن بطوطہ کا دوسرا سفر (نثری مجموعے)، دریں اثنا (شعری مجموعہ) اور میرے شب و روز (ترجمہ)۔

ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد نے نصرت ظہیر کی ادبی خدمات کا اعتراف کرکے ان پر ایک خصوصی نمبر شائع کیا ہے۔ زیر نظر نمبر میں کئی اہم ادیبوں اور نقادوں نے نصرت کے فکر و فن پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی نثری نگارشات، کلام اور کارٹونز کا انتخاب بھی اس نمبر میں شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح نصرت ظہیر کی شخصیت اور فن پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے بارے میں مختلف لوگوں کی رائے ہے کہ وہ بیباک، اصول پرست، محبتی مگر جذباتی، بظاہر کڑوے کسیلے اور بد دماغ لیکن اعلا پائے کے طنز نگار ہیں۔ نصرت ظہیر کی اکثر و بیشتر نگارشات سے مقصدیت صاف جھلکتی ہے۔ معاشرے کی اصلاح و تعمیر ان کا منصب رہا ہے۔ ان کے مضامین میں طنز کی نشتریت ہوتی ہے لیکن مزاح کی چاشنی انھیں تلخ بننے سے روکتی ہے حالانکہ بہ قول محمد حسن ان کا مزاح 'زود ہضم' قسم کا مزاح ہے۔ ایک جانب وہ تازہ موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں جیسے مسلم ووٹوں کی تجارت، مہنگائی، رہائشی مکانوں کی قلت، بوتل میں سودا وغیرہ اور دوسری جانب زندگی سے جڑی ہلکی پھلکی وارداتوں کو مزاح کا رنگ دے کر انسانی دوغلی پر چوٹیں کرتے ہیں جیسے اردو ادیبوں کے سفرنامے، ضعیف الاعتقادی (طلسمی انگوٹھی!)، گورنمنٹ اور پبلک اسکولوں میں امتیاز وغیرہ۔ چند نمونے پیش خدمت ہیں:

"مسلمان دنیا کی واحد قوم ہے جس کے پاس سوائے ماضی کے اس دنیا کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے اور امریکن دنیا کی واحد دوسری قوم ہے، جس کے پاس سوائے ماضی کے سب کچھ ہے اور وہ دنیا کو سب کچھ دے سکتا ہے، ایٹم بم، اسرائیل، ویتنام، ملا عمر، بن لادن، اور نہ جانے کیا کیا۔"

(اُف یہ دولت کا)

"شاعری (شاعری)، شاہی امام اور شاہی دستر خوان، یہی تو ہماری کمزوریاں ہیں۔"

(کہت کبیر سنو بھئی سادھو)

"مسلمان کا حساب سیدھا ہے، الیکشن ہوں تو مہنگا ہو جاتا ہے اور الیکشن گزر جائیں تو کوئی دھیلے کو نہیں پوچھتا۔" (مسلمان اور پیاز)

مختصر یہ کہ ماہنامہ 'شگوفہ' کا تازہ شمارہ اردو ادب میں طنز و مزاح کے حوالے سے ایک گراں قدر اضافہ ہے اور ہر اس ادب نواز کے لیے اس کا مطالعہ کرنا ضروری ہے جو طنز و مزاح سے دل چسپی رکھتا ہو۔ یوں بھی یہ رسالہ طنز و مزاح کے میدان میں اپنی ایک انفرادی پہچان بنا چکا ہے۔

○○○

نام کتاب : **گوپال متل**
ذات و صفات
مرتب : پریم گوپال متل
ضخامت : ۴۰۰ صفحات
قیمت : ۳۰۰ روپے
ملنے کا پتا : موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج
نئی دہلی- ۱۱۰۰۰۲
تبصرہ نگار : ڈاکٹر سید معصوم رضا عشروی

اردو ادب کے مثلث میں ناشران ادبی کتب کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اردو ادب کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہر دور میں کچھ ایسے حضرات کا تعاون اردو ادب کو حاصل رہا ہے جو نہایت مخلص اور ادب کے شناسا یا فن پاروں اور فن کاروں کے قدرداں رہے ہیں۔ ایسی ہی ایک شخصیت کا نام گوپال متل ہے جو موڈرن پبلشنگ ہاؤس کے روح رواں تھے۔ گوپال متل نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اس زمانے میں شعرا و ادبا کی زبان اردو ہوا کرتی تھی۔ گوپال متل نے بھی ابتدائی تعلیم منشی کریم بخش (مالیر کوٹلہ) سے حاصل کی۔ رفتہ رفتہ تعلیمی سلسلہ پروان چڑھتا رہا اور اسی اثنا میں ادبی ذوق بھی مزاج میں رچ بس گیا۔ بی اے کرنے کے بعد لدھیانہ جاکر 'صبح امید' نام کا ادبی رسالہ نکالا۔ بعد میں ادبی جریدے 'شاہکار' کی ادارت سنبھالی، پھر جگت لکشمی کا اداریہ لکھنا شروع کیا۔ تقسیم کے بعد دلی آئے 'ملاپ' اور 'تیج' میں کام کیا اور پھر ایک اہم ستون بن گئے۔

گوپال متل صاحب کی شخصیت میں جو رواداری تھی اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کا حلقۂ احباب ادب بڑھتا گیا۔ ادبی کارگزاریوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ بیک وقت مدیر، شاعر، مبصر، نثر نگار، سوانح نگار اور ناشر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ گوپال متل ہمہ جہت فنکار تھے۔ وہ ادب نواز بھی تھے اور ادیب نواز بھی۔ زیر تبصرہ کتاب میں گوپال متل کی ذات و صفات سے متعلق تقریباً پچیس مضامین شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کنول سعیدی، کرشن موہن، رضا نقوی واہی، کمار پاشی، محمود سعیدی، امیر قزلباش اور عزیز تمنائی وغیرہ کے منظوم خراج عقیدت کے ساتھ گوپال متل کی کچھ منتخب تخلیقات جس میں خود نوشت، نظمیں، غزلیں، بے بول، تبصرے، متفرق اشعار اور کئی مضامین اس میں شامل ہیں۔ کتاب میں شامل مضامین پر نظر ڈالیں تو ان کے احباب ذوق اور کرم فرماؤں میں کشمیری لال ذاکر، دیویندر ستیارتھی، حیات اللہ انصاری، عنوان چشتی، سلیمان اطہر جاوید، رشید حسن خاں، بلراج کومل، انور سدید، ندا فاضلی، شمیم، کاف. انظام نظیر صدیقی اور آزاد گلاٹی وغیرہ کے تاثراتی مضامین بھی لائق ستائش ہیں۔ کتاب میں ۱۵ صفحات میں گوپال متل کی یادگار تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔ پریم گوپال متل نے اردو کے عظیم ناشر کو خراج عقیدت پیش کرنے کا جو عظیم کتابی شکل میں کیا ہے وہ بلاشبہ لائق ستائش ہے ورنہ کئی اہل علم و ادب کو یہ موقع بھی میسر نہیں ہوتا خواہ ان کی اولادیں لائق ہی کیوں نہ ہوں اس لیے خوش قسمت ہیں گوپال متل صاحب جنھیں اولاد اور ارباب ادب کا تحریری خراج عقیدت ملا اور اسے منظر عام پر کتابی شکل میں پیش کرکے پریم گوپال متل نے نہ صرف گوپال متل کو زندہ رکھا ہے بلکہ ایک پبلشنگ ادارے کے روح رواں کا ذکر بھی باقی رکھا ہے۔

○○○

بقیہ: فلم ڈائرکٹر داؤد چاند

صفحہ ایک سے آگے

پوسٹے کے دیدار کے لیے موجود رہتے تھے۔ پران اُن دنوں لاہور میں بننے والی فلموں کا مقبول ترین ہیرو تھا۔ وہ خوش پوش تھا اور خوب رو بھی۔ اس کے امیرانہ ٹھاٹھ دیکھتے ہی بنتے تھے۔ لاہور کے بڑے بڑے رئیسوں کی طرح تانگہ رکھا ہوا تھا جو دوسرے سب تانگوں سے زیادہ خوب صورت تھا اور ہر ہیروئن اس تانگے پر بیٹھنے کی خواہش مند ہوا کرتی تھی۔ پران نے فلم 'پرائے بس میں' میں غضب کی اداکاری کی تھی۔ بٹوارے کے بعد اس نے بمبئی پہنچ کر سینکڑوں فلموں میں کام کیا اور بہت نام کمایا مگر راقم کی نظر میں 'پرائے بس میں' اُس کی سب سے اچھی فلم تھی۔ اس کی اتنی اچھی ایکٹنگ مجھے بعد کی فلموں میں نظر نہیں آئی۔ فلم میں وہ ہیروئن سے محبت کرنے لگتا ہے اور اُسے بدمعاشوں کے چنگل سے آزاد کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ میں نے یہ فلم کئی بار دیکھی تھی۔ اس کا وہ منظر میں کبھی نہیں بھولتا جب وہ راوی کے کنارے گھاس کے لان پر بیٹھے ہوئے اپنی محبوبہ نیلم (آشا پوسلے) سے یہ سوال کرتا ہے: "نام نیلم، ماتھے پر بندیا، ہندو مسلم اتحاد کچھ سمجھ میں نہیں آیا"۔ اس موقعے پر پران کا سوال کرنے کا انداز اور آشا پوسلے کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہی بنتے تھے۔ ایک اور موقعے پر جب بدمعاش ہیروئن کو غائب کر دیتے ہیں تو پران لاہور کی سڑکوں پر اس کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے، ان مناظر میں پران کے چہرے پر جو درد و کرب دیکھا وہ بعد میں اُس کی کسی اور فلم میں نظر نہیں آیا۔ فلم 'پرائے بس میں' کلکتہ کے ایک سیٹھ سیپٹ لال نے فنانس کی تھی۔ سیٹھ نے داؤد چاند سے وعدہ کیا تھا کہ اگر فلم کامیاب رہی تو میں تمھیں انعام دوں گا۔ فلم نے اچھا بزنس کیا۔ اُنھی دنوں لاہور میں فرقہ وارانہ تناؤ پیدا ہو گیا۔ لوٹ مار، آتش زنی اور چھرے بازی کی وارداتیں ہونے لگیں، شہر کی رونق کو گھن لگ گیا اور نوبت ملک کے بٹوارے تک پہنچ گئی۔

پران لاہور سے بمبئی چلا آیا۔

داؤد چاند نے لاہور میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ کچھ عرصہ فلمی سرگرمیاں ٹھپ رہیں۔ پاکستان کی فلم انڈسٹری کو سخت دھچکا لگا۔ داؤد چاند بے کار ہو گیا۔ اُس نے بڑھیا ولایتی سگریٹوں کی جگہ بیڑی پینی شروع کر دی اور ماچس کی تیلیوں کی بھی گنتی کرنے لگا۔ کڑکی حد سے بڑھ گئی تو اسے سیپٹ لال کا انعام دینے کا وعدہ یاد آیا۔ اُس نے سیٹھ کو کلکتہ خط لکھ بھیجا کہ میں ان دنوں خالی ہاتھ ہوں اور خاصا پریشان ہوں۔ اس خط کا اثر ہوا اور سیٹھ نے اپنے ایک دوست کی معرفت داؤد چاند کو پانچ سو روپے بدرے کے طور پر بھیج دیے جنھیں پاکر چاند بہت خوش ہوا۔ اُس نے روپے ابھی جیب میں ہی رکھے تھے کہ مالک مکان پہنچ گیا جس نے سال

بھر کا کرایہ لینا تھا۔ اس نے چاند کو دھمکی دی کہ کرایہ فوراً ادا کر دو یا پھر میں اپنے آدمیوں کے ذریعے تمہارا سامان گھر سے باہر پھنکوا دوں گا اور تمہیں گھر بدر کر دوں گا۔ پانچ سو روپے کی یہ رقم چاند کے کام نہ آسکی اور مالک مکان کی جیب میں چلی گئی۔

چند روز بعد امید افزا بات یہ ہوئی کہ سیٹھ سیوک لال نے چاند کو لکھا کہ کلکتہ آکر میرے لیے فلمیں بناؤ لیکن چاند کے گھر والے اس کے حق میں نہیں تھے۔ وہ چاند کے کلکتہ جاکر کام کرنے کے خلاف تھے۔ کچھ دنوں بعد سیٹھ نے پھر لکھا کہ تمہیں کلکتہ آنے میں ہچکچاہٹ ہے تو میں لاہور آکر تمہاری ڈائرکشن میں فلم بنانے کے لیے تیار ہوں۔ ایک ڈوبتے ہوئے انسان کے لیے مژدۂ جانفزا تھا۔

داؤد چاند نے اپنی بیوی شاہجہاں بیگم کے ساتھ مل کر ایک ہی ہفتے کے اندر کہانی کا خاکہ تیار کیا اور اس کا نام 'چندڑی' رکھا جسے پنجابی زبان میں فلمایا جانا تھا۔ کہانی لکھ کر اس نے کلکتہ بھیج دی۔ کئی دنوں تک کوئی جواب نہ آیا تو چاند سمجھا کہ سیٹھ گول ہوگیا ہے اور وعدے سے پھر گیا ہے۔ بات یہ نہیں تھی۔ سیٹھ صاحب بیمار ہوکر دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔

کس مپرسی کے عالم میں داؤد چاند نے پنجابی فلم 'تندری' بنائی مگر وہ ناکام ہوگئی۔ یار لوگوں نے اسے گھٹیا فلم قرار دے کر چاند کو بیکار بٹھا دیا۔ اس کی غیرت یہ گوارا نہیں کرتی تھی کہ وہ کسی کے پاس کام مانگنے کے لیے جائے۔ اس کا کلکتہ کا پرانا دوست اور رفیق فوٹو گرافر اے حمید اس سے اکثر کہا کرتا تھا کہ اگر تمہیں کسی کے پاس جانے میں جھجک ہے تو میں جاکر کسی سے بات چیت کرتا ہوں مگر چاند اسے بھی اپنی توہین سمجھتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ فلم پروڈیوسر خود چل کر اس کے پاس آئیں اور اُسے اپنے لیے فلم بنانے کے لیے کہیں۔ اُسے تلاشِ معاش کی اتنی فکر نہیں تھی جتنی اپنی غیرت کی۔ چناں چہ اس نے بیڑیوں کے کتنے ہی بنڈل پھونک ڈالے۔ وہ سارا سارا دن پان چباتا اور تھوکتا۔ بیچاری شاہجہاں بیگم کا سروتہ چلاتے چلاتے بُرا حال ہوگیا۔ گھر میں جو تھوڑے بہت زیورات رہ گئے تھے ان کے بکنے کی نوبت آگئی۔ ایک شریف پرانا دوکاندار تھا جو آٹا اور چاول بھیج دیا کرتا تھا لیکن خالی آٹے اور چاول سے تو کھانا تیار نہیں ہو جاتا، دیگر لوازمات ندارد تھے۔ اچانک ایک روز دستِ غیب سے مدد پہنچی۔ ایک پرانے فلم ساز کے پاس اپنی ایک پرانی فلم کے رش پرنٹ موجود تھے۔ فلم کچھ وجوہ کی بنا پر مکمل ہونے کے باوجود ایڈیٹنگ کی منزل تک نہ پہنچ سکی تھی۔ یہ فلم ملک کے بٹوارے سے پہلے داؤد چاند کی ہدایت میں ہی مکمل ہوئی تھی۔ اس فلم ساز نے کہا کہ چاند اگر تم یہ فلم ایڈٹ کر دو تو میں تمہیں چار سو روپے دوں گا۔ چاند تیار ہوگیا اور اس نے دن رات ایک کر کے فلم مکمل کر دی۔ یہ معمولی سی رقم پاکر بھی اُسے اتنی مسرت حاصل ہوئی جتنی شاید معمول کے دنوں میں چالیس ہزار روپے پاکر بھی نہ ملتی۔ آٹے چاول والے دوکاندار کا پچھلا حساب چکتا کیا اور دال روٹی چلانے کا سامان پھر اُدھار پر گھر آنے لگا۔

کچھ دن بعد پھر ایک آدمی چاند کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ سر آغا خاں کی زندگی پر ایک مختصر ڈاکومنٹری فلم تیار کر دو۔ اگرچہ اس آدمی نے معمولی رقم کی آفر دی لیکن ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا۔ اتنے میں فلم پروڈیوسر جگدیش چند آنند نے فلم 'مستی' اردو میں بنانے کا اعلان کر دیا اور ہدایت کاری چاند کے سپرد کر دی۔ چاند نے جب کلکتہ میں 'مستی' پنجابی زبان میں تیار کی تھی تو اس کی ہیروئن بالو تھی جو بعد میں مدقوق ہوکر چل بسی تھی، اب اردو میں بننے والی اسی نام کی فلم کی ہیروئن مرحومہ بالو کی حسین و جمیل دختر صبیحہ تھی۔ صبیحہ اس سے پیشتر کچھ فلموں میں کام کر چکی تھی لیکن اسے کوئی خاص کامیابی نہیں ملی تھی۔ نئی 'مستی' خوب چلی اور اس نے سلور جوبلی منائی۔ اس نے پاکستان میں محبوب کی رنگین فینٹسی 'آن' کے برابر بزنس کیا۔ صبیحہ شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گئی اور چاند اندھیرے سے اُجالے میں آگیا۔ وہ اپنے ملک کی فلمی صنعت میں سب کا محبوب بن گیا۔ اس کے بعد جگدیش چند آنند نے اپنی دو اور فلموں 'بِلّا' اور 'تراؤ' کی ڈائرکشن بھی اس کے سپرد کر دی۔

اردو فلم 'مستی' کی بنا پر چاند کو ایک بدنامی بھی سہنی پڑی۔ اس نے ایک ہندستانی فلم 'شرط' کا مشہور گانا "نہ یہ چاند ہوگا نہ تارے رہیں گے، مگر ہم ہمیشہ تمہارے رہیں گے" جوں کا توں فلم میں رکھ دیا تھا جو سرقہ اندازی کی بدترین مثال تھی۔ ہندستان میں اس کا زبردست نوٹس لیا گیا اور سبھی فلمی اخبارات نے اس کی بھرپور مذمت کی لیکن پاکستان میں ہندستانی فلموں کا سرقہ ایک عام بات تھی اس لیے وہاں کسی نے خاص توجہ نہیں دی۔ بعد ازاں اس ہدایت کار نے بیگم ملک شریف کے اشتراک میں فلم 'انجلی' بنائی، یہ فلم بہت سستے بجٹ کی تھی پھر بھی چل نکلی۔ اس فلم کی ریلیز کے بعد 'حاتم' اور 'مرزا صاحباں' کی ڈائرکشن کے فرائض انجام دیے۔

داؤد چاند کے کالے رنگ کو لے کر کسی زمانے میں فلمی حلقوں میں کئی لطیفے مشہور تھے۔ قریب 70 برس پہلے کی بات ہے، ایک مشہور کمپنی نے اپنے صابن کے اشتہار میں لکھا کہ ہمارا صابن رنگت نکھارتا ہے اور کالے کو گورا بناتا ہے۔ داؤد چاند یہ اشتہار پڑھ کر اس صابن کی درجن بھر ٹکیاں گھر لے آیا۔ روزانہ دو تین گھنٹے نہانے میں لگاتا اور پوری صابن کی ٹکیہ ایک غسل میں استعمال کر ڈالتا۔ بارہ روز گزر گئے تو اس نے اپنی بیوی شاہجہاں بیگم سے پوچھا کہ کیا تم مجھ میں کوئی تبدیلی محسوس کر رہی ہو۔ بیگم نے جواب دیا ہاں تبدیلی محسوس کر رہی ہوں، اب تم سارا دن بدن کھجلاتے رہتے ہو۔ بات یہ ہوئی کہ کثرت کے ساتھ صابن کے استعمال سے جلد خشک ہوگئی اور پورا دن کھجلی کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ چاند نے اپنے دوست اے حمید سے اس کا ذکر کیا تو اس نے کہا کہ اگر صابن کے استعمال سے رنگت بدل جائے تو بھی سیاہ فام انسان اب تک سفید فام بن چکے ہوتے۔ اے حمید نے مشورہ دیا کہ اگر تم روزانہ ایک سیر ٹماٹر اور ایک درجن سنگترے کھانا شروع کردو تو تمہارے چہرے پر لالی ضرور آجائے گی۔ نئی تجویز پر عمل شروع ہوگیا۔ چاند ٹماٹر اور سنگترے کی ڈھیریاں لگا کر بیٹھ جاتا اور آئینہ اپنے پاس رکھ لیتا۔ دونوں چیزیں مزے لے کر کھاتا جاتا اور تھوڑی دیر بعد آئینہ دیکھتا کہ کتنی لالی نمودار ہوگئی ہے۔ ایک ہفتے بعد چاند نے اپنی بیگم سے پھر وہی سوال کیا کہ کیا تم مجھ میں کوئی تبدیلی دیکھ رہی ہو تو شاہجہاں بیگم نے جواب دیا کہ ہاں دیکھ رہی ہوں۔ چاند خوشی سے پھولا نہ سمایا اور پوچھا کہ کیا تبدیلی آئی ہے؟ بیگم بولی اب تم سارا دن چھینکیں مارتے ہو، تمہیں زور کا زکام ہوگیا ہے۔

اے حمید نے نیا نسخہ بتایا۔ کہنے لگا چاند میاں زہر کو زہر مارتا ہے۔ تمہارے کالے رنگ کو کالی چیزیں ہی ختم کر سکتی ہیں، تم ہر روز ایک سیر کالے انگور اور ایک سیر کالے جامن کھایا کرو، پھر دیکھو چہرے پر کیا بہار آتی ہے، پورا بدن نکھر جائے گا۔ جو دوست نے کہا ویسا ہی چاند نے کیا۔ دس روز کے بعد اس نے بیگم سے پھر پوچھا مجھ میں کسی تبدیلی کا احساس کر رہی ہو۔ شاہجہاں بیگم بولی تم پہلے سے بھی زیادہ کالے ہوگئے ہو۔

◆◆◆

بقیہ: اقبال کی شاعری میں ہندستانیت

صفحہ ۸ سے آگے

نہیں کرسکتا۔ اس کی یادیں اور تصورات اس کے لاشعور میں رچ بس جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ اس کی شخصیت کا اٹوٹ حصہ بن جاتے ہیں۔ اقبال پنڈت نہرو کی ذہانت اور ان کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ جب ان سے ایک صحافی نے سوال پوچھا کہ جناح اور نہرو کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے تو اقبال نے بغیر کسی توقف کے کہا کہ جناح سیاست داں ہیں اور نہرو محبِ وطن ہیں۔ نہرو کی دیش بھگتی مثالی تھی۔ اقبال نے اپنے معاصرین کے کردار کی بہترین عکاسی کی۔ مختصر سا جواب گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ ان کی شاعری میں وطن مالوف کا دل دھڑکتا ہے۔ علامہ اقبال نے نابغۂ روزگار، شاعرِ جاوداں مرزا غالب کی عظمتوں کا اعتراف کھلے لفظوں میں یوں کیا ہے:

محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشتِ فکر سے اگتے ہیں عالم سبزہ وار
زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں
تابِ گویائی سے ہے جنبش لبِ تصویر میں

اتنا بھرپور خراجِ عقیدت غالب کو شاید ہی کسی نے پیش کیا ہو۔ ایک اور اہم سنگِ میل مملکتِ خداداد کے فرماں روا ٹیپو سلطان کی تلاش و جستجو اور دانشوری کو سلام ہے۔ اقبال نے مجاہدِ آزادی ٹیپو سلطان کی زبان سے جو خیالات شعری پیکر میں پیش کیے ہیں وہ لافانی ہیں۔ وہ رہتی دنیا تک گونجتے رہیں گے۔ اس سے اقبال کی ٹیپو سے روحانی شیفتگی کا پتا چلتا ہے۔ وہ مردِ عالی مرتبت جس کے نام سے انگریز کانپ اٹھتے تھے، جو خودداری، عزتِ نفس اور مخالف سامراج کی علامت بن گیا تھا، علامہ اس کی زبان سے ایسے اشعار کہلواتے ہیں جن کا فکری دنیا میں ایک خاص مقام ہے:

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول
صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

اقبال نے ٹیپو کے عمیق نظریے کی مکمل ترجمانی کی ہے۔ اس کا نظریہ حریت تھا۔ وہ کسی بھی قیمت پر اپنی زندگی اور ریاست کو فرنگیوں کے ہاتھوں فروخت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے آدرشوں کی سربلندی کے لیے جامِ شہادت نوش کیا لیکن ظالموں کی شرائط قبول نہیں کیں۔ یہاں اقبال کا فلسفۂ خودی آشکار ہوتا ہے۔ وہ جمود اور تعطل کے خلاف تھے۔ اس سے بڑھ کر وہ غلامانہ ذہنیت کے سخت خلاف تھے۔ اسے وہ قوموں کے حق میں سم قاتل سمجھتے تھے۔ وہ تغیر و تبدل کے علمبردار تھے۔ ان کی فکر رسا میں ہندستانی مفکرین، اکابرین اور عارفین کی جھلک پائی جاتی ہے۔ وہ ہند کے جغرافیہ ہی نہیں اس کی تاریخ و تمدن سے بہت متاثر رہے۔ ان کے گہرے نقوش ہمیں ان کی شاعری میں دکھائی دیتے ہیں۔ ہم انھیں ہندستان کا صفِ اول کا دانا اور بلند قامت شاعر مانتے ہیں۔ ان کے ارشادات ہر دور اور ہر عہد میں تر و تازہ رہیں گے۔

☆☆☆

اقبال کی شاعری میں ہندستانیت

ڈاکٹر مسعود جعفری (8-1-43/1/A/5، پوسٹ آفس شیخ پیٹ، حیدر آباد- 500 008)

آفاقی فکر و نظر کے علمبردار نے جہاں مشرق و مغرب کے حالات پر اظہار خیال کیا ہے وہیں علامہ اقبال نے ہندستان جنت نشان کی عظمتوں اور بلندیوں کو بھی سلام کیا ہے۔ وہ ہندستان کے سنتوں، صوفیوں، شاعروں اور مذہبی پیشواؤں سے متاثر رہے۔ اس کا اعتراف کھل کر جابجا کیا ہے۔ اس کے علاوہ دریاؤں، پربتوں کی بھی بے پناہ تعریف و توصیف کی ہے۔ اس کے بعد بھی کوئی اقبال کی سرزمین ہند سے والہانہ انسیت کو دیکھ نہیں پاتا تو اس کی ذہنی کجروی کو کیا کیا جائے۔

اقبال سنسکرت کے عظیم شاعر بھرتری ہری سے اتنا Inspire ہوئے کہ انھوں نے اس کے خیال کو اپنی مادری زبان کے سانچے میں ڈھال دیا اور اس شعر کو مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ ملاحظہ کیجیے:

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

بھرتری ہری ساتویں صدی میں شہنشاہ ہرش وردھن کے عہد میں تھا۔ تیرہ سو سال بیت جانے کے بعد بھی اس کے افکار تازہ ہے اقبال کی فکر کو جلا ملی اور انھوں نے اس کے خیال کو شعری جامہ پہنایا۔ پہلے مصرعے کو مثبت اور منفی انداز میں پڑھا جاسکتا ہے۔ اقبال نے صدیوں سے بہتی ہوئی دریائے گنگا کی تعریف بڑے انوکھے پیرایے میں کی ہے:

اے آب رود گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

اقبال نے وادی گنگ و جمن میں مسلمانوں کی آمد کی جانب اشارہ کیا ہے۔ اس میں کسی بحث یا شک و شبہے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس شعر کے مخاطب آریا لوگ ہرگز نہیں ہوسکتے کیوں کہ آریاؤں کا ورود پنجاب اور سندھ کے زرخیز میدانوں میں ہوا۔ شہاب الدین محمد غوری کے جانشین قطب الدین ایبک، التمش وغیرہ نے گنگ و جمن کے دوآبہ میں اپنی سلطنت کی بنیادیں رکھیں۔ مسلمانوں نے گنگا کے پانیوں سے اپنی پیاس بجھائی۔ اقبال نے ہمالہ کے جلال و جمال کے ساتھ اس کے حفاظتی وجود کی اہمیت کو ایک مورخ کی طرح تسلیم کیا ہے:

پربت وہ سب سے اونچا ہم سایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

اگر ہمالیہ کے فلک بوس پہاڑوں کا سلسلہ نہ ہوتا تو ہمارا ملک منگولوں کے حملوں کا شکار ہوجاتا۔ ہماری قومی صیانت زبردست خطرات سے دوچار ہوجاتی۔ اقبال نے اسی تاریخی نکتے کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس شعر سے ان کے تاریخی شعور کا پتا چلتا ہے۔ اقبال نے خانقاہی نظام پر سخت چوٹ کی ہے۔ اس کے مکینوں کو دعوت عمل دیتے ہوئے پیام دیا ہے:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری

لیکن اقبال محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیا کی شان میں رطب اللسان ہیں۔ ایک ایک لفظ سے عقیدت و مودت کا جذبہ چھلک رہا ہے۔ پوری نظم تاثراتی اور عشق ولی اللہ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس کی قرأت سے وجدانی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ مقامات عارف و سالک کا ادراک ہوتا ہے:

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری فیض عام ہے تیرا
ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم
نظام مہر کی صورت نظام ہے تیرا
تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا
نہاں ہے تیری محبت میں رنگ محبوبی
بڑی ہے شان بڑا احترام ہے تیرا

اقبال نے اپنے دلی احساسات کو ایک مسافر کی التجا کے ذریعے پیش کرنے کی سعی مشکور فرمائی ہے۔ ان اشعار میں اقبال کے قلب کی دھڑکن سنی جاتی ہے۔ اللہ والوں سے انھیں غیر معمولی عشق تھا۔ اس میں مذہب، عقیدہ، ذات پات، رنگ و نسل، جغرافیائی حد بندیوں کی کوئی قید نہیں تھی۔ ان کا زاویہ نظر عالمی تھا۔ اقبال کا عمل کی دنیا پر یقین کامل تھا۔ حضرت رام بھی عمل کے نقیب تھے۔ انھوں نے جمود کے جگر کو پاش پاش کیا تھا۔ نیکی و بدی کے معرکے میں سچائی کا پرچم ہاتھ میں اٹھایا تھا۔ اقبال نے انھیں بھرپور خراج تحسین پیش کیا ہے:

تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوش محبت میں فرد تھا
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند

آگے چل کر اقبال ہندستان کے فلسفیوں، سائنس دانوں، سماجی دانشوروں کے علم و فضل اور تعقل پسندی کا اعتراف کرتے ہیں۔ ان کی علمی و ادبی کاوشوں کی بدولت ملک آسمان کی اونچائیوں کو چھونے لگا ہے:

یہ ہندیوں کے فکر فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بام ہند

اقبال نے ہندستان کی شان و شوکت کی آئینہ داری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پاکستان چلے جانے سے ان کے یہ خیالات ختم نہیں ہوجاتے۔ کوئی شخص جسمانی طور پر کسی خاص جغرافیائی خطے میں فروکش ہوجاتا ہے تو اس کے تصورات دائمی رہتے ہیں۔ جوش کے پاکستان میں بس جانے سے ان کی ہندی شاعری کا خاتمہ نہیں ہوسکتا۔ کارل مارکس کے لندن چلے جانے سے ان کے جرمن کا پس منظر غائب نہیں ہوتا۔ نپولین کے دور افتادہ جزیرہ سینٹ ہیلینا میں جا کر مر جانے سے اس کے فرانس اور یورپی کارناموں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلسلے میں سیکڑوں مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ اقبال کے مزاج کی تعمیر اور ذہنی ارتقا میں ہندستان کے فلسفہ، حکمت و دانائی اور تہذیب و ثقافت کا بڑا رول رہا ہے۔ ان کا آبائی وطن کشمیر تھا اور ان گل پوش وادیوں میں قلندروں، صوفیوں، شاعروں کی صدائیں صدیوں سے گونجتی رہی ہیں۔ فراخ دلی، وسیع المشربی، امن و سلامتی طرز حیات رہی ہیں۔ اقبال کی شاعری بھی بنی نوع انسان کی فلاح و نجات سے عبارت ہے۔ اسے فرقہ وارانہ خانوں اور ملکوں میں تقسیم کرنا عقلی ٹھوکر کھانے کے مترادف ہے۔ اقبال کا روح افزا کلام ہمیشہ نسل انسانی کو جینے کا پیغام دیتا رہے گا۔ اقبال نے وطن کی مٹی سے ٹوٹ کر محبت کی ہے، اسی لیے وہ کہتے ہیں:

خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

اس سے بڑھ کر اور کیا حب الوطنی کا ثبوت ہوسکتا ہے۔ اقبال نے شری کرشن کی بھی ستائش کی ہے۔ انھوں نے گیتا کو سراہا ہے۔ اس سے عمل کی تلقین ملتی ہے۔ اقبال عمل کو زیست اور بے عملی و جمود کو موت سمجھتے تھے۔ اقبال نے بڑی کشادہ قلبی سے سرزمین ہند کی عہد آفریں ہستیوں کے افکار و ارشادات کی تعریف کی ہے۔ کہیں بھی ہمیں ذہنی تحفظات کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ اقبال کی عظمت کا راز بھی ہے کہ وہ خالق فلسفۂ خودی ہوتے ہوئے بھی دیگر انسانیت کے عاشقوں کے نظریات سے انکار نہیں کیا۔ اقبال کی قومی شاعری ہر دور میں فرقہ واریت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں امید و بیم کی نقرئی لکیر رہے گی۔ اقبال محبتوں اور رفاقتوں کے جادہ پر اکیلے چلتے رہے۔ انھوں نے اپنی خلش اور دلی چبھن کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے:

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو درد نہاں ہمارا

اقبال کے آبا و اجداد کشمیری تھے۔ انھیں بھی اس جنت ارضی سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ گل پوش وادیوں اور خوب صورت چناروں کے اشجار کو فراموش نہیں کرسکے۔ ان کا حوالہ ہمیں ان کے شعروں میں ملتا ہے:

جس خاک کے ضمیر میں ہو آتش چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاک ارجمند

اس اہم و نادر شعر سے ان کی کشمیر سے دلی وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ ان کے اسلاف اس حسین و جمیل سرزمین کے رہنے والے تھے، اس پر انھیں ناز بھی تھا۔ نہرو کا سلسلہ بھی کشمیر ہی سے تھا۔ اس زاویے سے دیکھیں تو دونوں میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ انسان سب کچھ بھول سکتا ہے لیکن وہ پرکھوں کی دھرتی کو نظر انداز

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

ادارے کا مضمون نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے ــــ (ادارہ)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ: ثمر آفسٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲-راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237210, 23236299, Fax: 011-23236299
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org